حیات مجاہد اعظم

سید محمد قاسم رضوی

از

واجد رضوی

حیاتِ

مجاہدِ اعظم

سیّد محمد قاسم رضوی

از

واجد رضوی

بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی (عثمانیہ)

ناشر

کاروانِ ادب، کلیم پریس بلڈنگ۔ لارنس روڈ۔ کراچی

بار اوّل سنہ ۱۹۵۲ء ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۰۰۰

قیمت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

مطبوعہ کلیم پریس۔ کراچی

فہرست

حیدرآباد کی رُوحِ آزادی کے نام

پیش لفظ

واجد رضوی صاحب بی اے، ایل ایل بی نے وکالت کی سند حاصل کرنے کے کچھ ہی عرصہ بعد سے سید محمد قاسم رضوی صاحب کے جونیر کی حیثیت سے کام شروع کیا، ان کو سید صاحب کے ساتھ رہنے اور ان کی زندگی کے ہر پہلو کا بغور مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا۔ واجد رضوی صاحب نے حیدرآباد کی جدوجہد آزادی میں بھی سید صاحب کے دوش بدوش کام کیا ہے، اور اسی وجہ سے انکو سید صاحب کی سیاسی زندگی کا اچھی طرح علم ہے۔ واجد رضوی صاحب مسلمانانِ دکن کی جدوجہد کے ہر پہلو سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ اس حیثیت سے سید صاحب کی سوانح حیات جتنی جامع اور مکمل واجد صاحب لکھ سکتے ہیں، شاید دوسرا نہ لکھ سکے۔ انہوں نے سید صاحب کی سوانحہ لکھ کر شاگردی اور دوستی کا پورا پورا حق ادا کیا۔

"حیاتِ مجاہدِ اعظم" نہ صرف سید صاحب کی مکمل سوانحہ ہے بلکہ مسلمانانِ دکن کی جدوجہد آزادی کی مختصر سی تاریخ بھی ہے۔ سقوطِ حیدرآباد کے اسباب کے متعلق بڑی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے بڑی حد تک ان غلط فہمیوں کا ازالہ ہوجاتا ہے۔

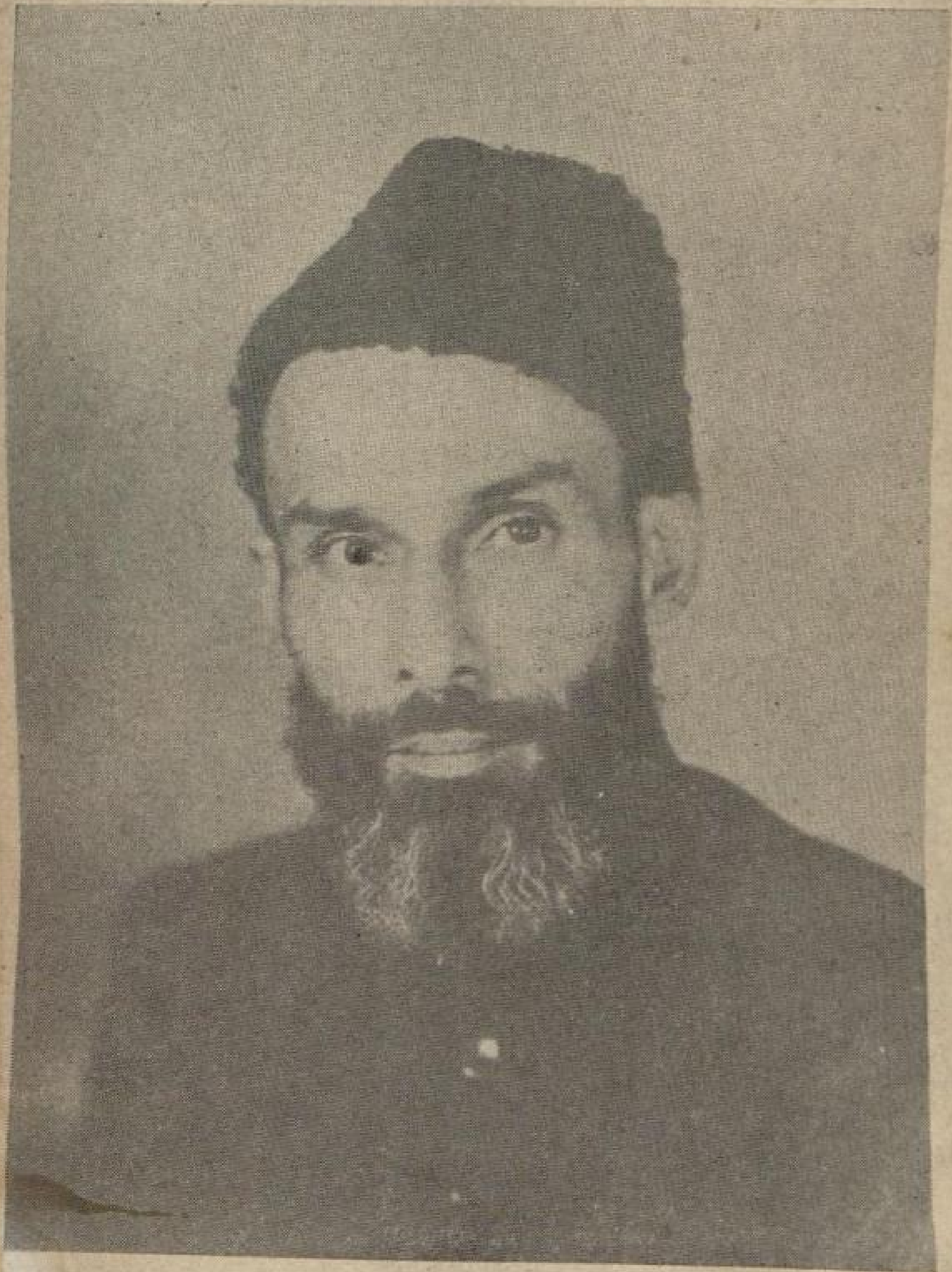
واجد رضوی صاحب قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے "حیاتِ مجاہدِ اعظم" لکھکر عوام کو سید قاسم رضوی صاحب کی زندگی اور مسلمانانِ دکن کی جدوجہد سے روشناس کیا۔

محمود حسین

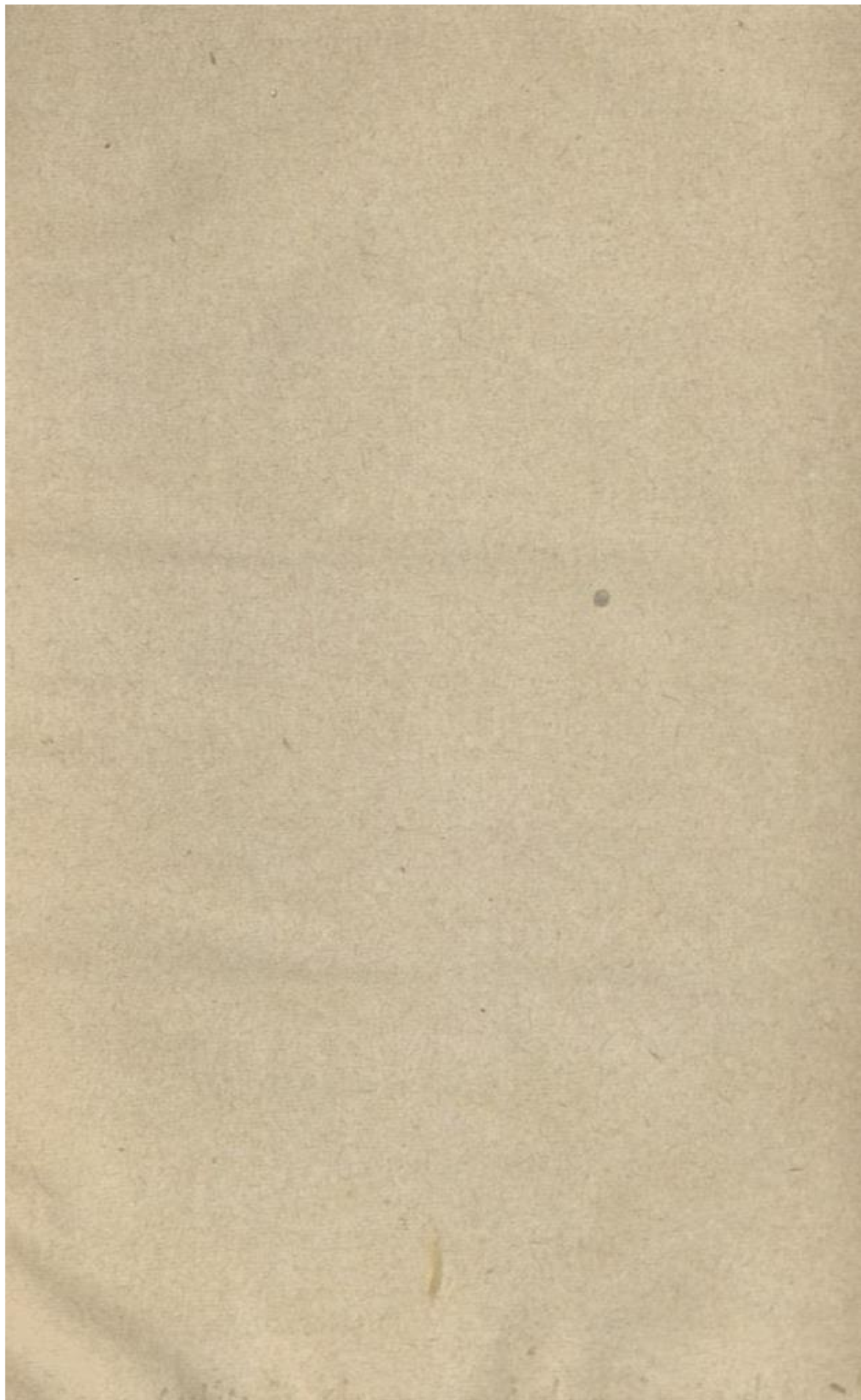
مارچ ۱۹۵۲ء

(عزت مآب ڈاکٹر محمود حسین وزیر امور کشمیر حکومتِ پاکستان)

۱۹۴۸ء



دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجاہدِ اعظم

باب اول

نگاہِ اوّلیں

دیدہ ور

اقتدار کی خواہش فطرتاً ہر انسان میں پائی جاتی ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں سیادت و بالادستی کا تصور موجود ہے، اور ابتدائے آفرینش ہی سے انسانی معاشرہ کی ہر شکل میں چند نمایاں شخصیتیں نظر آتی ہیں۔ جو خاص اثر اور اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ یہ اثر کہیں خاندانی بزرگی کی وجہ سے قائم ہوتا ہے، کہیں شخصی وجاہت سے، اور کہیں دولت کی فراوانی کسی کو ممتاز کر دیتی ہے۔ لیکن حقیقت کو عریانی میں دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ سیادت اور قیادت کا درجہ اس سے بہت بلند و بالا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ خاندانی

عظمت سے عوام مرعوب ہو جائیں۔ شخصی وجاہت کے آگے لوگ سرِ تسلیم خم کردیں، اور دولت کی نمایش سے انسانی آنکھیں خیرہ ہوجائیں، لیکن سستی شہرت اور جھوٹی ناموری کبھی انسانی درد کی دوا اور قوموں کے مسائل کا حل نہیں ہوسکتی، اور نہ اس کو حقیقی عظمت کے اُس مرتبہ سے کوئی تعلق ہوتا ہے، جس کو سیادت و قیادت کہا جاتا ہے۔ اور جہاں کسی دیدہ ور کی نگاہِ تیز دلِ وجود کو چیر کر نوعِ انسان کے درد کی تشخیص اور اقوام کی مشکلات کا حل دریافت کرتی ہے۔ عظمت و بڑائی کی اس بلندی تک بہت کم لوگ پہنچتے ہیں اور بہت کم انسانوں کو یہ سعادت نصیب ہوتی ہے ——

بے چین انسانیت صدیوں منتظر رہتی ہے اور ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے، تب کہیں کوئی دانائے راز، کوئی دیدہ ور پیدا ہوتا ہے۔ اور حق کی فتح اور ضمیرِ حیات کے سکون کے لئے بے شمار سامان فراہم کردیتا ہے —— دکن کی تقدیر بھی صدیوں نگاہِ مردِ مومن کی منتظر رہی، اور گلستانِ دکن میں نرگس مسلسل روتی رہی، تب کہیں ایک مردِ مجاہد، ایک دیدہ ور قاسم رضوی کی شکل میں نمودار ہوا، جس کے وجود سے خاکِ دکن کا ایک ایک ذرہ آفتاب کی طرح چمک اُٹھا، اور سارا چمن روشن اور بقعۂ نور ہوگیا ——!

مسیحا نفس اسلامیانِ ہند کی عظمت و شوکت سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد تاریخ کے سینہ میں دفن ہوگئی اور سیاسی بحران

کے ساتھ ساتھ معاشی، معاشرتی اور تمدنی تباہی کے طوفان سے بھی اُنھیں دو چار ہونا پڑا۔ ذہن و فکر کی بلندیاں نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہی قوم مختلف عمرانی کمزوریوں میں اس طرح مبتلا ہوگئی جس طرح کہ جسم انسانی پیچ در پیچ امراض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور کوئی دوا اُس پر کارگر نہیں ہوتی۔ اُس کے دل و دماغ سے احساسات مٹ جاتے ہیں اور وہ موت سے قریب تر ہوتا جاتا ہے لیکن ماہرینِ جسمانیات یہ کہتے ہیں کہ اِن حالات میں بسا اوقات مشیتِ ایزدی کے مطابق ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ دفعتاً چند قوتیں مریض کے اندر ہی اندر پیدا ہوتی ہیں، جو ان امراض کا مقابلہ کرتی ہیں۔ اور مریض دیکھتے ہی دیکھتے تندرست و توانا ہو جاتا ہے۔ اور ماہرینِ عمرانیات کا یہ کہنا ہے کہ جسم انسانی کا یہ اُصول انسانی معاشرہ پر بھی صادق آتا ہے۔ اور جیسا کہ تاریخ سے ظاہر ہے مغلیہ سلطنت کی تباہی کے بعد مسلمانانِ ہند بے شمار عمرانی اور سیاسی امراض میں اس قدر مبتلا ہوگئے تھے کہ کوئی تدبیر، کوئی حکمت کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ اُن کے دل و دماغ سے اِن امراض اور ان کی مضرتوں کا احساس بھی زائل ہو گیا تھا۔ اور لاہور کی سرزمین سے ایک دردمند دل پکار اُٹھا تھا کہ

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

لیکن قدرت کو ہماری موت مقصود نہیں تھی، توحید کے علمبرداروں کی فنا منظور نہیں تھی، اور اسی سبب سے دنیا نے دیکھا کہ مسلمانانِ ہند کے اندر ہی اندر دفعتاً چند قوتیں بیدار ہوگئیں جو برطانوی ہند میں قائدِ اعظم کی شکل میں نمودار ہوئیں تو دکن میں مجاہدِ اعظم قاسم رضوی کی صورت اختیار کر گئیں۔ نتیجتاً مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعی صحت مند ہوتی گئی۔ اور آن کی آن میں وہ ایک زندہ قوم کی شکل میں دنیا کے سامنے آگئے ——— قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ میں مافوق الفطرت انسانوں کی داستانیں جنھوں نے مردہ قوموں کو نئی زندگی عطا کی، بار بار پڑھی ہیں۔ لیکن سرزمینِ دکن پر کسی مسیحا نفس کو عہدِ حاضر نے تو قاسم رضوی ہی کی شکل میں دیکھا ہے ———!

روحِ صداقت قاسم رضوی ایک خوش حال اور باوقار خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ ان کے دادا۔ چچا۔ اور والد مال عدالت اور کوتوالی میں اعلیٰ خدمات[1] پر فائز رہے ہیں۔ اور حکومت

---

[1] ان کے والد سید احمد خاں رضوی کمیٹی صرف خاص کے معتمد ہو گئے تھے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد پیشۂ وکالت میں داخل ہوگئے۔ دادا اکبر خاں رضوی معتمد کوتوالی تھے۔ دونوں چچا احسن خاں رضوی اور اکرم خاں رضوی سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے۔ چچازاد چچا امجد علی خاں ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے۔ سر عباس بیگ ان کے خالو تھے۔

اور دربار شاہی میں اس خاندان کا اثر و رسوخ قابلِ رشک رہا ہے
——— لیکن سیاسی زندگی میں جو مقام قاسم رضوی نے حاصل کیا وہ
اُنھیں وراثتاً نہیں ملا تھا ——— بلکہ حرّیت و صداقت کی اس روح نے
جو اُن کے دل کی گہرائیوں میں پنہاں تھی، اُنھیں یہ درجہ عطا کیا، اور انسانیت
کی سربلندی کے اُس تصوّر نے جس نے اُن کے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا
تھا اُنھیں اس مقامِ بلند تک پہنچا دیا!

یہ رتبۂ بلند ملا، جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں!

باب دوم

حالاتِ ابتدائی

قافلۂ حجاز کا ایک حُسینؓ ایک قافلہ ریگستانِ حجاز سے چلا، اور علاؤ الدین خلجی کی سرداری میں بندھیاچل کی بلندیوں کو عبور کر کے سطحِ مرتفع دکن کو صدیوں اپنے خونِ جگر سے سینچتا رہا، لیکن ٹیپو کی شہادت کے بعد قافلۂ حجاز میں ایک حُسین بھی باقی نہ رہا۔ اور جب انسانی ذہن وفکر سے حُسینیت کے نقوش کے مٹنے کا اندیشہ لاحق ہوگیا تو مشئیتِ ایزدی نے موسیٰ[1] کے کنارے اُس کے گیسو کو تابدار کرنے کے لئے حسینؓ ہی کے خاندان میں ایک اور حُسینؓ کو پیدا کر دیا ——— !

سنہ ۱۹۰۲ء میں ماہِ مئی کی ۳۱- تاریخ تھی، آفتاب کی تمازت کمزور پڑ چکی تھی، شام کا سُہانا وقت تھا، آلوز منزل میں خوشی کے شادیانے بج رہے تھے، اور سُرخ و سفید رنگ اور سنہرے بالوں والے

---

[1] آلوز منزل جس میں قاسم رضوی پیدا ہوئے، دریائے موسیٰ کے قریب واقع ہے۔ جو شہر حیدرآباد کے درمیان بہتا ہے۔

سید احمد خاں رضوی کی روشن آنکھوں سے شادمانی جھلک رہی تھی۔
......! قدرت مسرور تھی کہ دکن کی سرزمین کو مژدۂ جاں فزا دیدیا
گیا تھا، اور عرشیوں کے لئے صبحِ عید تھی کہ ایک ملت کو خوابِ
غفلت سے بیدار کرنے والا پیدا ہوگیا تھا۔۔۔۔۔!

آزاد فضا انسانی کردار کی تعمیر ماحول کی رہینِ منت ہوتی ہے
اور بچوں کے ذہن و فکر کے ارتقاء پر ماں باپ کے
رجحانات اور گھر کی فضا کا گہرا اثر پڑتا ہے۔۔۔۔۔۔ قاسم رضوی نے
ایک آزاد فضا، اور ایک آزاد خیال ماں کی آغوش میں آنکھیں کھولیں،
اُن کی والدہ عائشہ بنت احمد بن عبداللہ ایک سمجھدار، روشن خیال
اور پڑھی لکھی خاتون تھیں، اور اپنے عہد کی عام خواتین کی طرح
سریع الاعتقاد اور توہم پرست نہیں تھیں۔ اُن کے والد سید
احمد خاں رضوی بھی آزاد منش اور آزادیِ فکر کے حامی تھے۔ بچوں
کی تربیت میں اُن کے احساسات اور رُجحانات کا بہت لحاظ رکھتے
تھے۔ لیکن آزاد پیشوں کی طرف اُن کو مائل کرنے میں بڑی فرحت
محسوس کرتے تھے۔ بالخصوص قاسم رضوی کو وہ وکیل ہی بنانا چاہتے
تھے، اور اُن کے طریقۂ استدلال اور طرزِ گفتگو کی بناء پر اُنھیں ابتدا
ہی سے "وکیل" کہتے تھے۔۔۔۔۔۔ اُس وقت کون جانتا تھا کہ عائشہ
بنت احمد کا یہ لاڈلا اور آلوز منزل کا یہ نونہال ایک روز دکن کا سب
سے بڑا وکیل بن کر دشمنوں سے بھی خراجِ تحسین حاصل کرے گا!

سیّد احمد خاں رضوی بچوں کو کشمکش حیات کے لئے تیار کرنا چاہتے تھے، اور اس غرض سے اُن میں خود اعتمادی پیدا کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ آمرانہ انداز میں انھوں نے کبھی کوئی حکم نافذ نہیں کیا، بلکہ کسی بات کو تحریکِ ذہنی (Auto-Suggestions) ہی کے ذریعہ بچوں کے ذہن نشین کرنا مناسب سمجھا۔ وہ مخیّر تھے، اور غریبوں و محتاجوں میں اپنی ساری کمائی صرف کردیتے تھے۔ اور جب لوگ اُن سے پوچھتے کہ اپنی اولاد کے لئے کیا چھوڑ جائیں گے؛ تو وہ جواب دیتے کہ "پوت اگر کپوت ہو تو دھن کا ہیکو، اور پوت اگر سپوت ہو تو دھن کا ہیکو" اور یہ ایک حقیقت ہے کہ آوارہ بچوں کے لئے موروثی دولت آوارگی میں اضافہ کا باعث ہوتی ہے، اور سعادت مند و جفاکش انسان باپ دادا کی دولت کا کبھی محتاج نہیں ہوتا ــــــــــــ قاسم رضوی نے بھی باپ کے متروکہ پر کبھی نظر نہیں رکھی، بلکہ اپنے حصّہ سے اپنی بیوہ بھاوج کے حق میں دست بردار ہوگئے!

گرمیِ حیات بچوں کی شرارت اُن کی ذہانت پر دلالت کرتی ہے، اور اُس بلندی کی مظہر ہوتی ہے جو قدرت اُن کے لئے متعیّن کردیتی ہے۔ دراصل گرمیِ حیات بچّے کی شرارت اور "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" میں نمایاں ہوتی ہے ـــ قاسم رضوی کی شرارت خاندانی زندگی کا ایک دلچسپ پہلو تھی۔ وہ

بے حد شریر تھے، اور اپنی شرارت پر اصرار کرتے تھے۔ گھر کے چھوٹے اور بڑے۔ بچوں پر اُن کی حکومت تھی ——— انور منزل کے درمیانی ہال میں باقاعدہ دربار منعقد کیا جاتا؛ گھر اور محلّہ کے بچّے صف بستہ کھڑے ہوتے۔ شیشم کی بڑی کُرسی پر ننّھا قاسم گھُٹنے ٹیک کر چڑھ جاتا اور "درباریوں" کو مخاطب کرتا احکام صادر ہوتے اور تعمیلِ حکم ہر "شخص" پر لازم ہوجاتی ———!

دن بھر کی دھوم دھام اور شوروغل سے جب عاجز آتیں تو اُن کی والدہ اُنھیں شرارت سے باز رکھنا چاہتیں۔ اس پر باقاعدہ مباحثہ شروع ہوجاتا، دلائل اور براہین پیش ہوتے اور جب بچوں کے اِس فطری حق کے خلاف کچھ کہنے میں وہ ناکام ہوتیں تو بالآخر ایک کمرہ میں قاسم کو بند کردیتیں ——— ! لیکن شرارت قید و بند سے بالاتر ہوتی ہے، اور گرمیِ حیات ہر جگہ اپنے لئے مظاہر تلاش کرہی لیتی ہے! ——— گھر والوں کو شام کی چائے پر میوہ نہ ملنے کی وقتاً فوقتاً شکایت ہورہی تھی۔ ملازمین پر شبہ کیا جارہا تھا۔ لیکن عائشہ کو بہت جلد پتہ چل گیا کہ جس کمرہ میں قاسم کو بند کیا جاتا ہے اُس کمرہ میں رکھا ہوا میوہ نوکر نہیں کھا رہے ہیں ———!! اب اُنھیں دوسرے کمرہ میں بند کیا جانے لگا۔ لیکن شام تک اُس کمرہ کا سارا اسباب کھُل جاتا، صندوقوں سے تمام چیزیں باہر آجاتیں اور ایک ہنگامہ ہوتا۔ اِس لئے تیسرا کمرہ اُن کے لئے

منتخب کیا گیا۔ لیکن اُس کمرہ کے نوادرات پر تحقیقات شروع ہوئی، اور کئی اشیاء تحقیقات کی نذر ہوگئیں ــــــــــ اور بالآخر شیشہ کی ایک الماری نظربندی کے لئے تجویز کی گئی! ــــــ اُس زمانہ میں شہر حیدرآباد کے کسی حصہ میں ریڈیو سیٹ نظر نہیں آتا تھا، لیکن اوز منزل کو وقتاً فوقتاً ایک ریڈیو سیٹ ضرور میسر ہوتا، جس سے عمدہ تقریریں اور تبصرے، دلچسپ گانے اور مکالمے نشر ہوتے رہتے تھے!

قدرت کا انتظام

شیر خوار موسیٰ (علیہ السلام) کو ماں کی گود سے جُدا کرکے دریائے نیل کی طوفانی موجوں کی آغوش میں اس لئے ڈال دیا گیا تھا کہ ایک روز دریا کے طوفانوں ہی سے اُنھیں اپنی راہ نکالنی تھی .... دراصل زندگی کی مشکلات کے لئے قدرت انسان کو تیار کرتی ہے، اور جب میکدۂ حیات کا ایک ایک قدح خوار پکار اُٹھتا ہے کہ "ربنا ولا تحملنا مالا طاقت لنا بہ" تو ساقیِ فطرت بھی جھوم جھوم کر کہتا ہے۔

"دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر"

پہلے ظرفِ قدح خوار کو دیکھ لیا جاتا ہے، انسان کی صلاحیت اور حوصلہ کو جانچا جاتا ہے، اور اُسی کے مطابق زندگی کی دشواریوں کا بوجھ اُس پر عائد کیا جاتا ہے ــــــ قاسم رضوی کو بھی انسانی کردار کے سخت امتحانات سے گزرنا تھا، اِس لئے قدرت نے اُنھیں بچپن ہی سے بڑی آزمائشوں میں ڈال دیا تھا۔ ابھی چار سال کے ہونے بھی نہ

پاتے تھے کہ ماں کی مامتا سے محروم کردیئے گئے، اور تقدیر کے فیصلہ نے شفیق باپ سے بہت دُور لکھنؤ میں اُنہیں لا پھینکا۔۔۔۔۔ چارسالہ بچے کی نگہداشت کے لیے ماں کی توجہات، باپ کی شفقت یا نانی کی مہر و محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن قدرت نے یہ چاہا کہ ان سارے سہاروں کو توڑکر قاسم رضوی کو اس عمر ہی میں اپنے پاؤں پر کھڑا کردے، اور خود اعتمادی کے جوہر کو اور بھی اُجاگر کردے۔۔۔۔!

لکھنؤ میں وہ ایک عرصہ تک فرنگی محل کے بورڈنگ ہاؤس یا اپنے والد کے ماموں کے گھر میں مقیم رہے جو اپنے عہد کے چند خوش حال اور شوقین رئیسوں میں تھے۔ اُن کے ہاں 'ہر شب شب برات' اور ہر روز روزِ عید' تھی۔ رات میں شہر کی پری چہرہ گانے والیاں جمع ہوتیں اور محفل عیش و نشاط صبح تک جاری رہتی۔۔۔۔۔ قاسم رضوی کے رجحانات کے لئے یہ سخت امتحان تھا۔ ذرا قدم ڈگمگاتے اور وہ قعرِ مذلت میں جاگرتے، اور ذرا سی لغزش اُن کے کردار کو پامال اور زندگی کے دھارے کو بدل دیتی۔ لیکن قدرت اُن کی حفاظت کررہی تھی، اور اس لئے ابتداء ہی سے اِن محفلوں سے وہ دُور رہے اور اُن کے دل و دماغ نے اس کے کوئی اثرات قبول نہیں کئے۔ حافظ کو شکایت تھی کہ:-

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردئی
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

لیکن قاسم رضوی نے "درمیانِ قعرِ دریا" بھی اپنے دامن کو تر نہیں ہونے دیا۔ اُن کے لئے یہ صورتِ حال وجہِ شکایت نہیں تھی، بلکہ اُن کی غیرت کے لئے ایک تجربہ گاہ، اور قوتِ ارادی کے لئے ایک مہمیز! اعلیٰ مقاصد کو نظر انداز کرنے کے لئے دولت، اقتدار اور حُسن کی آئندہ پیش کش کی جانے والی تھی، اور دنیا کی ان دلکشیوں کی اُنھیں مزاحمت کرنا تھی۔ —— قدرت نے قبل از قبل اس کا انتظام کر لیا تھا!

ہونہار بروا

قاسم رضوی کی ابتدائی فارسی اور عربی کی تعلیم فرنگی محل میں ہوئی، قرأت بھی اُنھوں نے وہیں سیکھی۔ علم کے حاصل کرنے میں وہ تیزی سے ترقی کرتے جا رہے تھے، اور اُن کی ذہانت اساتذہ کے لئے باعثِ حیرت اور طلبہ کے لئے قابلِ رشک بنی ہوئی تھی۔ بالخصوص علم قرآن میں اُن کی گہری دلچسپی یقینِ محکم کی اس منزل کو نشان زد کر رہی تھی، جہاں اُنھیں بہت جلد پہنچنا تھا۔

یہ غیر معمولی صورتِ حال حصولِ علم ہی تک محدود نہیں تھی بلکہ نوعِ انسان کے لئے اُن کی ہمدردیوں نے بھی انوکھی شکل اختیار کر لی تھی —— غریبوں سے وہ بہت متاثر رہتے تھے اور ہر مہینے اپنا جیب خرچ حاجت مند طلبہ میں تقسیم کر دیتے تھے۔ کسی طالب علم کے جسم پر پھٹے کپڑے دیکھکر اُنھیں بے حد تکلیف ہوتی، اور وہ اس طرح اُس کی مدد کرتے کہ اُس کی حمیّت کو بھی کوئی صدمہ نہیں پہنچ سکتا۔ اُنھیں چھوٹی پنسلیں جمع کرنے کا بہت "شوق" تھا۔ اُن کی

میز پر چھوٹی پنسلوں کے ڈھیر لگے رہتے تھے۔ بات دراصل یہ تھی کہ کسی غریب طالب علم کے ہاتھ میں پنسل کا چھوٹا ٹکڑا اُن کو بے چین اور مضطرب کر دیتا، اور وہ اپنی بڑی پنسل اُسے دے کر اُس کی چھوٹی پنسل اس حیلہ سے حاصل کر لیتے کہ چھوٹی پنسلیں جمع کرنے کا اُنھیں "شوق" ہے! —— غریب طلبہ سے یہی تعلق خاطر تھا جو آئندہ انجمن اعانتِ مسلم طلبہ[1] میں جلوہ گر ہو کر بے شمار مفلس خاندانوں کی تعلیمی ترقی اور بہبودی کا باعث ہوا!

فرنگی محل سے علومِ شرقی کے فارغ التحصیل ہو کر امتحان میٹرک کے لئے قاسم رضوی کلکتہ گئے، آخری پرچہ حل کر ہی رہے تھے کہ حیدرآباد سے والد کے انتقال کی خبر ذریعۂ تار پہونچی۔ لیکن سر ضیاء الدین مرحوم نے امتحان گاہ سے باہر نکلنے تک اس کی اطلاع اُنھیں نہیں ہونے دی۔ شفیق باپ کی جُدائی کا اُنھیں بہت صدمہ ہوا اور وہ پہلی ٹرین سے حیدرآباد روانہ ہو گئے۔

ذوق وشوق

سید احمد خان رضوی کی رحلت نے قاسم رضوی کی اعلیٰ تعلیم کی راہ میں بڑی مشکل پیدا کر دی۔ جملہ متروکہ پر اُن کی دو سوتیلی والدہ قابض تھیں۔ البتہ کچھ رقم کسی نہ کسی طرح قاسم رضوی کو حاصل ہو گئی تھی۔ خاندان میں کوئی ایسا فرد

---

[1] لاتور میں قاسم رضوی نے انجمن اعانت مسلم طلبہ قائم کی تھی، جس کے تحت ایک بورڈنگ ہاؤس تھا جہاں نادار طلبہ کی تعلیم اور اُن کے قیام کا مفت انتظام کیا جاتا تھا۔

نہیں تھا جو اُن کی طرف توجہ کرتا، اور نہ اُن کی حمیت کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی اُنھیں اجازت دیتی۔ دوستوں نے ملازمت کا مشورہ دیا، عزیزوں نے ترکِ تعلیم کی رائے دی۔ لیکن علم کی پیاس قاسم رضوی کو کب چین سے بیٹھنے دیتی۔ اُن کی قوتِ ارادی مشکلات پر قابو حاصل کرتی گئی۔ اُن کے ذوق و شوق کے آگے بڑی بڑی چٹانیں برف کی طرح پگھلتی گئیں اور بالآخر اُنھوں نے اپنی ذات پر اعتماد کر کے مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میں داخلہ حاصل کر ہی لیا!

اُس زمانہ میں مسلم یونیورسٹی علیگڈھ مسلمانانِ ہند کی حیاتِ اجتماعی میں ایک خاص مقام رکھتی تھی۔ یہی واحد تعلیمی ادارہ تھا جو قومی تمناؤں کا مرکز اور معاشرتی و سیاسی ارتقار کا باعث تھا۔ اُس نے کمزور جسدِ قومی میں برق کی لہر دوڑا دی تھی، اور اُس کی آغوش نے مسلمانانِ ہند کو متعدد مُصلح اور رہنما عطا کئے تھے ـــــ ۱۹۱۹ء میں منشائے ایزدی نے ایک اور سپوت کو اُس کے دامنِ تربیت میں ڈال دیا تھا!

قاسم رضوی نے علیگڈھ سے بی، اے اور ایل ایل۔ بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اُن کا تعلیمی ریکارڈ جامعہ کے لئے باعثِ فخر تھا، لیکن جس چیز نے جامعہ کی آنکھوں کو چکا چوند کیا وہ اُن کی خارج از نصاب سرگرمیاں (EXTRA CURRICULAR ACTIVITIES) تھیں۔ وہ ایک سنجیدہ مقرر کی حیثیت سے اسٹوڈنٹس یونین پر چھائے ہوئے تھے

وہ بہترین ڈرامہ نویس اور فطری اداکار تھے، اور اس سلسلہ میں یونیورسٹی سے متعدد انعامات حاصل کئے تھے۔ خوش الحان ایسے تھے کہ ساتھیوں کو گھنٹوں مدہوش کردیتے، اور بانسری اس طرح بجاتے کہ دُور دُور سے لوگ سُننے کو آتے، بقول کسے

جہاں بیٹھ کر وہ بجاتا تھا بین
تو سُننے کو آتے تھے آہوئے چین

فٹ بال اور کرکٹ کے وہ بہترین کھلاڑی تھے۔ فٹ بال میں وہ رائٹ آوٹ (Right out.) کھیلتے تھے، اور کھیل میں اُن کے ساتھی اکرام اللہ صاحب[1] کی موجودگی جو لفٹ آوٹ (Left out.) کھیلتے تھے، میاچ کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی تھی۔ قاسم رضوی سے زیادہ تیز دوڑنے والا جامعہ میں کوئی موجود نہیں تھا اور اس کے لئے وہ ہمیشہ پہلا انعام حاصل کرتے تھے۔

زندہ دلی

جامعۂ علیگڈھ سے جہاں اُنھوں نے اکتساب نور کیا وہاں اُس کی اجتماعی زندگی پر اپنی شرارت اور جرأت کے گہرے نقوش بھی چھوڑے ہیں، اُن کی شرارتیں بے انتہا تھیں، لیکن اُن کی نوعیت کبھی انتقامی یا تخریبی نہیں تھی، کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جبکہ اُن کی حیات افروز "کارگزاریاں" طلبہ اور اساتذہ کی

---

[1] سیاسی زندگی میں بھی اکرام اللہ صاحب قاسم رضوی کے ساتھ رہے اور بالآخر لائق علی کابینہ میں وزیر ترقیات ہوگئے تھے، آج کل کراچی میں مقیم ہیں۔

جولانیِ طبع کا باعث نہ ہوتیں۔ شرمیلے یا بد دماغ اور مغرور طلبہ پر شرطیہ پانی ڈالنا اور فاختہ[1] اُڑانا اُن کی شرارتوں کی خصوصیات تھیں جب ایسے طلبہ کو کھلم کھلا الٹی میٹم ملتا تو وہ اپنی حفاظت اور قاسم رضوی کی گرفتاری کی خاص طور پر تدبیریں اختیار کرتے۔ مختلف راستوں پر اور اندرونی حصوں میں پہرے قائم ہو جاتے، اور باری باری جاگنے کا انتظام ہوتا۔ لیکن قاسم رضوی اپنے ذہن میں راستوں کا ایک خاکہ ترتیب دے لیتے، جہاں سے گزر کر وہ گھات میں بیٹھے موقع کے منتظر رہتے۔ یہاں تک کہ رات کے دو اور تین بجے کے درمیان جاگنے والوں پر نیند کا غلبہ ہوتا، اور جہاں ذرا اُن کی آنکھ جھپکتی، قاسم رضوی بجلی کی طرح "گھات" سے نکل کر اپنا کام پورا کر لیتے اور اس تیزی سے واپس ہوتے کہ تعاقب کرنے والے غبارِ راہ میں گم ہو جاتے!

سرسید ہال ویسٹ کا ایک مخصوص گروہ تھا جس کا قائد بہت بدمزاج اور مغرور سمجھا جاتا تھا، اس گروہ کے متعدد ارکان تختۂ مشق بنائے جا چکے تھے اور قاسم رضوی سے بہت خفا تھے۔ ایک روز اُنھوں نے چیالنج دیا کہ اگر اُن کے قائد پر پانی ڈالا جائے تو ہمیشہ کے لئے ہار مان لی جائے گی۔ ایس۔ ایس ویسٹ کی دوسری منزل کو

---

[1] ڈاکٹر ایم۔ ایم۔ احمد پروفیسر کامکس اکیڈیمی پر (جو پروفیسر حلیم کے غالباً بھانجے ہیں) جو شرطیہ فاختہ اُڑایا گیا تھا۔ اُس کی یاد ابھی تک صاحب موصوف کے دل میں تازہ ہے۔

ایس۔ ایس۔ ایسٹ سے جس میں قاسم رضوی رہتے تھے، لکڑی کی سیڑھیوں کے ذریعہ ملایا گیا تھا، اور صرف یہی ایک راستہ تھا جس سے رات کے وقت اُس ہاسٹل میں داخلہ ممکن تھا، سیڑھیوں سے کچھ فاصلہ پر دو کمروں کے عقبی حصہ میں کچھ جگہ خالی تھی جہاں بجلی کا فیوز لگا ہوا تھا اور آخری کمرہ میں پارٹی کا سردار رہتا تھا۔ اُس دن مغرب ہی سے ایس ایس ویسٹ میں انتظامات شروع ہوئے اور سیڑھیوں سے متصلہ کمروں میں خاص طور پر لوگوں کو متعین کیا گیا۔ قاسم رضوی کی شرارت اور جرأت کے لئے یہ سخت امتحان تھا لیکن وہ نا اُمید نہیں تھے، بلکہ اپنی "مہم" کے ہر پہلو پر غور کر کے ایک نتیجہ پر پہنچ گئے تھے ـــــ رات میں تین بجے جب ذرا سناٹا ہوگیا۔ تو قاسم رضوی سیڑھیوں پر تیزی سے گزرے اور آگے بڑھکر بجلی کے فیوز کو اڑا دیا۔ سیڑھیوں پر کسی کے دوڑنے کی آواز سُن کر قریبی کمروں میں متعینہ لوگ باہر نکل آئے اور اندھیرے میں ایک دوسرے سے دست گریبان ہوگئے۔ سیڑھیوں پر یہ ہنگامہ ہو ہی رہا تھا کہ قاسم رضوی آخری کمرہ میں پہنچے، چشمِ زدن میں اپنا کام کیا اور دوسرے راستہ سے نیچے اُتر کر تعاقب کرنے والوں کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئے!

پروفیسر سید حبیب اُن دنوں پرووکٹر مقرر ہوئے تھے۔ طبیعتاً وہ ذرا خشک تھے، اور قاسم رضوی کے خلاف دن رات کی شکایتوں سے عاجز آچکے تھے۔ بار بار اُنھیں سمجھاتے۔ لیکن وہ ہمیشہ یہی کہتے

کہ اگر وہ لوگوں کو ستاتے ہیں تو انہیں عین موقع پر گرفتار کیوں نہیں کیا جاتا ؟ ——— بہرحال جب شکایتوں کا سلسلہ طویل ہو گیا، تو پروفیسر حبیب نے یہ سزا تجویز کی کہ قاسم رضوی ہر رات اُن کے گھر جاکر سویا کریں ——— حکم کی تعمیل کی گئی! لیکن ہاسٹل میں فاختہ اُڑانے اور پانی ڈالنے کی وارداتوں کا سلسلہ بدستور جاری رہا! ———

——— بات یہ تھی کہ آدھی رات گزرنے کے بعد پروفیسر حبیب کے گھر سے کسی نہ کسی طرح وہ نکل جاتے اور برق کے دوش پر سوار ہو کر اپنے مخصوص راستوں سے ہاسٹل پہنچتے، اپنی مہم سر کر لیتے اور دس منٹ کے اندر اندر اپنی خواب گاہ کو لوٹ جاتے!

پروفیسر حبیب نے بالآخر چوکیدار پٹھانوں کو ہدایت کی کہ قاسم رضوی پر کڑی نگرانی رکھی جائے، اور رات کے وقت کسی طرح بھی انہیں باہر نہ نکلنے دیا جائے۔ ادھر یہ احکام صادر ہوئے اور اُدھر قاسم رضوی نے ارادہ کر لیا کہ آج پروفیسر صاحب ہی کے ساتھ کوئی دلچسپ حرکت کی جائے ——— ! رات ہوئی، پٹھانوں نے بڑے انہماک سے پہرہ شروع کیا، رات گزرتی گئی، یہاں تک کہ دو بج گیا۔ قاسم رضوی "آرام" کر رہے تھے، گویا کہ گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے، ایک نے آگے بڑھ کر دیکھا، اُن سے بات کرنی چاہی اور دوسرے سے کہا " الک چوکرا تو سویا ہے۔" اس پر دونوں اپنے بستر بیرونی دروازہ سے لگا کر بیٹھ گئے پھر لیٹ گئے، اور بعد ازاں سو گئے، اور ایسے سوئے کہ صبح تک

انھیں کسی ہنگامہ کی خبر نہ ہوسکی !! قاسم رضوی آہستہ اُٹھے، اور ڈرائنگ روم کے دریچے کے شیشے توڑ کر اندر داخل ہوئے۔ کمرے کا جملہ اسباب فرنیچر، دریاں، قالین، چلمنیں اور دریچوں کے پردے، ایک جگہ جمع کئے، اور باہر والا دروازہ کھول کر چار چھ چکّر میں یہ سارا اسباب پرنسپل کے بنگلہ تک لے گئے، جو وہاں سے چھ فرلانگ پر واقع تھا. اُس بنگلہ کے ڈرائنگ روم کے دریچہ سے اندر داخل ہوئے، دروازہ کھولا اور وہاں کا جملہ اسباب سمیٹ کر الگ کیا، اور اُس کی جگہ پروفیسر صاحب کے گھر سے لایا ہوا اسباب اُسی قرینہ اور قاعدہ سے رکھ دیا، اور پھر پرنسپل صاحب کا اسباب اُسی طرح لیجاکر پروفیسر حبیب کے ڈرائنگ روم میں نہایت سلیقہ سے جما دیا —— صبح صادق تک اس کارروائی کا سلسلہ جاری رہا. ادھر پانچ کا گھنٹہ بجا، پروفیسر حبیب اُٹھ بیٹھے، اور اُدھر قاسم رضوی اپنے بستر پر دراز ہوگئے.

—— ! صبح ہوئی - پروفیسر حبیب اور پرنسپل کے گھر والے حیرت میں پڑ گئے، لوگوں کی عقل دنگ تھی، چوکیداروں کو کچھ سجھائی نہ دیتا تھا، تحقیقات شروع ہوئی، بازپرس کی گئی —— لیکن کون کہہ سکتا تھا کہ یہ جرأتِ رندانہ قاسم رضوی کے سوا کسی اور کی ہوسکتی ہے!

قاسم رضوی علیگڈھ چھوڑ کر چلے گئے، لیکن ایک عرصہ تک ان کی زندہ دلی کے گہرے ارتسامات جامعہ کے قلب پر باقی رہے. اُن کی شرارت طلبہ کے لئے روایت بن گئی، اور اُن کے "ہتھیاروں"

(لکڑیاں جن سے وہ صراحیاں توڑتے تھے۔ ٹوٹی ہوئی صراحیوں کے ٹکڑے، فیوز اُڑانے کے آلات وغیرہ) کو ایک شوکیس میں محفوظ کیا گیا، جس پر "قاسم رضوی کے ہتھیار" "Instruments of Qasim Rizvi" لکھا تھا۔ ــــ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کے اجلاسِ لاہور سے واپسی پر وہ علیگڈھ گئے۔ اس شوکیس کو اُنھوں نے دیکھا، گذری ہوئی کہانیاں یاد آگئیں ــــ اِک ہوک سی دل میں اُٹھی! اک درد سا پیدا ہوگیا!!

ندرتِ فکر گوشت اور پوست کا معمولی انسان کشمکشِ حیات سے گریز کرتا ہے، اور ہمیشہ سکون و چین کا طالب ہوتا ہے۔ دراصل انسان کے ذہن و فکر کا یہی وہ ناسور ہے جو فرد کو ترقی سے محروم اور غیر کی نظرِ کرم کا محتاج کر دیتا ہے، اور قوموں کو ذہنی اور بسا اوقات سیاسی غلامی میں جکڑ دیتا ہے۔ اِسی وجہ سے شاعرِ مشرق نے قناعت اور راحت کے فرسودہ نظریوں کو نذرِ آتش کر کے جستجو اور انقلاب کی تعلیم دی ہے۔ اُن کے نزدیک 'عشق' پہ بجلی حلال اور منزل حرام ہے۔ اُنھوں نے "رہ نوردِ شوق" کو منزل کی طرف جانے سے روکا ہے، اور 'عشق' کو تاکید کی ہے کہ

"لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول"

لیکن اقبال کی اس فکر سے ایک عرصہ قبل انٹرمیڈیٹ کا ایک

بیس سالہ طالب علم سر سید ہال کے ایک کمرہ میں راحت و سکون کے انہی پامال نظریوں پر غور کر رہا تھا ـــــــ قوموں کے عروج و زوال کی تصویریں تخیل کے پردۂ سیمیں پر آتی اور جاتی رہیں، اور پھر اُس کے سامنے اپنے ملک اور اپنی قوم کی تاریخ بھی تھی ـــــــ غزنوی کی تڑپ، شہاب الدین غوری کے سوز، تیمور کی جستجو میں جمیتِ اسلامی ارتقائی منازل طے کر رہی تھی، اور بابر کے پیچ و تاب پر معراجِ کمال کو پہنچ گئی تھی، اور پھر اکبر کی جنس پرستی سے زوال کی تاریخ شروع ہو کر جہانگیر کی رنگینیوں سے گزرتی ہوئی شہزادگانِ دہلی کی محفلِ عیش و نشاط میں داخل ہو گئی تھی۔ جہاں قانونِ قدرت نے اُس پر آخری مہر لگا دی تھی ـــــــ نوخیز قاسم رضوی نے شکست خوردہ قوم کو اس پستی سے نکال کر بلندی کی طرف لے جانا چاہا۔ اُن کی فراست نے فرسودہ نظام کو بدلنا چاہا۔ اور اُن کے دلِ بے قرار نے "قناعت و راحت" کے سومنات کو پاش پاش کر کے ایک آئیڈیل دنیا کے سامنے پیش کیا۔ ذیل کے اشعار جو سر سید ہال میں لکھے گئے تھے اسی آئیڈیل کی وضاحت کرتے ہیں:۔

میری تمنا

وہ راہ چلوں میں کہ جو منزل پہ نہ پہنچائے
ہر گام پہ اک حدِ سکندر نظر آئے

اُس بحر میں تیروں کو جو ساحل پہ نہ پہنچائے
ہر موج پہ اک مجھکو سمندر نظر آئے

وہ میری تمنا ہو جو پوری ہی نہیں ہوتی
وہ ضد جو اثر میں کبھی طوری نہیں ہوتی

وہ آہ ہو میری جو اثر کے لئے ترسے
بن جاؤں شجر وہ جو ثمر کے لئے ترسے

کھیتی سے مری منھ کے بھرے ابر گزر جائیں
آئیں تو یہ بے فیض، اِدھر آئیں اُدھر جائیں

گر خرمنِ امید کی قسمت کبھی پھر جائے
اندوختۂ عمر پہ بجلی میرے گر جائے

وہ درد اُٹھے دل میں جو ہر دل کو دکھا دے
تڑپوں وہ تڑپ میں جو مسیحا کو رلا دے

آنکھوں میں بھری نیند ہو پر خواب کو ترسوں
تشنہ لبِ ساحل پہ کھڑا آب کو ترسوں

عشقِ مجازی محبت انسانیت کا جوہر ہے۔ مصورِ حقیقی نے اسی سے مٹی کی تصویروں میں رنگ بھر دیا ہے اور ازل کے کیمیا گر نے اسی نسخہ سے ایک عالم کو زندگی عطا کی ہے۔ در اصل محبت فرد کے کردار کی بلندی اور قلب کی پاکیزگی پر دلالت کرتی ہے —— قاسم رضوی کی زندگی کا یہ پہلو بھی روشن اور تابناک ہے! اُنھیں اپنے ہی خاندان کی ایک لڑکی سے اُنس تھا، جو رفتہ رفتہ عشق کی منزل میں داخل ہو گیا۔ لیکن اس منزل کی راہ میں بڑی دشواریاں تھیں، ساحلِ مراد تک پہنچنا ناممکن تھا۔ طوفان اُمڈ رہے تھے، آندھیاں چل رہی تھیں، کشتی کا بادبان چاک چاک تھا، لنگر توڑ دیا گیا تھا —— کشتی ساحل سے قریب تر ہو رہی تھی کہ ایک چٹان سے —— خاندان کی عزت، عورت کے ناموس اور قدامت پرستی کے چٹان سے ٹکرا کر غرق ہو گئی!

——— بے زبان لڑکی کو غیر کے عقد نکاح میں باندھ دیا گیا! ———
جلوہ کی رات براتیوں کی آڑ سے اُنھوں نے اپنے دل کی ملکہ کو دیکھا، ٹوٹے ہوئے دل سے آہِ سرد نکلی اور درد انگیز اشعار کی روح بن کر فضائے بسیط میں پھیل گئی![1]

قاسم رضوی کی آنکھوں میں اندھیرا چھاگیا، دنیا تاریک ہو گئی۔ انھوں نے موٹر اُٹھائی، شہر کے باہر نکل گئے۔ موٹر پُوری رفتار سے جارہی تھی، پہاڑ کی ایک پُر پیچ گھاٹی سے سڑک گزر رہی تھی ——— غمِ اُلفت کی گھناؤنی تاریکی میں زندگی کی رنگینیاں دفن ہو چکی تھیں، کہیں کوئی روشنی نہیں تھی، کہیں کوئی نور کی کرن نہیں تھی اسٹیرنگ سے اُن کے ہاتھ ہٹ گئے، ایکسیلیریٹر پُوری طرح دب گیا، اور ایک دھماکہ کی آواز گھاٹی کے سینہ کو چیرتی ہوئی نکل گئی ———
گھُپ اندھیرے سے قدرت کے چمکیلے ہاتھ اُبھرے ——— قدرت کے چمکیلے ہاتھ جو کبھی مچھلی کے پیٹ میں، اور کبھی دریائے نیل کے طوفانوں میں انسان کی حفاظت کرتے ہیں اور کبھی نارِ نمرود سے اپنے دوست کو بچا لیتے ہیں ——— ! انہی ہاتھوں نے آگے بڑھکر قاسم رضوی کو بھی اپنی حفاظت میں لے لیا!

---

[1] اس سلسلہ کا یہ ایک شعر ہے جو کسی طرح مجھے دستیاب ہو گیا ہے:۔

چنگاریاں یہ میرے دلِ سوختہ کی ہیں
تیری جبیں پہ صورتِ افشاں لئے ہوئے

خانہ آبادی علیگڈھ سے بی۔اے کرنے کے بعد قاسم رضوی نے کلکتہ سے ایم۔اے (ابتدائی) کا امتحان کامیاب کیا، اور بعض مجبوریوں سے حیدرآباد چلے گئے۔ حیدرآباد میں اُن کے کردار نے اُن کے چچازاد چچا عبدالحیٔ صاحب رضوی کو اُن کی طرف رجوع کیا اُنھوں نے بھتیجے کو اچھی طرح پرکھا اور بالآخر ۱۹۲۶ء کے اوائل میں اپنی اکلوتی بیٹی نور جہاں بیگم کو اُن کے نکاح میں دے دیا۔

شادی کے بعد قاسم رضوی قانون کی ڈگری کے لئے علیگڈھ گئے اور ۱۹۲۸ء میں ال۔ال۔بی کا امتحان دے کر حیدرآباد لوٹ آئے۔

قاسم رضوی کا بچپن اور طالب علمی کا زمانہ ہم نے دیکھا، اور اُن کے رجحانات و میلانات کو بھی محسوس کیا۔ آئیے اس پسِ منظر میں اُن کی عملی زندگی اور قومی خدمات کا بھی مطالعہ کریں۔



باب سوم

وکالت

نکتہ رس کی تلاش ۱۹۲۸ء میں علیگڈھ سے واپسی پر قاسم رضوی نے حیدرآباد ہائی کورٹ سے سندِ وکالت حاصل کی اور چونکہ ابتداءً ایک سال کسی سینیئر وکیل کے ساتھ کام کرنا قانوناً لازم ہے۔ اس لئے اُنھوں نے کسی نکتہ داں کی تلاش شروع کی۔ اُن کی پہلی نظر رائے بشیشور ناتھ ایڈوکیٹ[1] پر پڑی، جن کی اُس زمانہ میں بڑی شہرت تھی۔ اُن سے قدیم خاندانی مراسم بھی تھے اور اِسی وجہ سے اُنھوں نے بخوشی قاسم رضوی کو اپنے ساتھ شریک کرلیا۔ لیکن جس کا ہر گام اوجِ ثریّا سے بلند ہو اُس کی نظر میں بیچارہ بشیشور ناتھ کہاں بچ سکتا تھا۔ رائے صاحب سے علٰحدگی اختیار کرکے قاسم رضوی نواب عسکری حسن[2] ایڈوکیٹ کے ساتھ ہوگئے اور کچھ روز

---

[1] رائے بشیشور ناتھ آئندہ چلکر حیدرآباد ہائیکورٹ کے چیف جسٹس ہوگئے تھے۔ اور وہاں سے وظیفہ پر علٰحدگی کے بعد ریاست بیکانیر کے چیف جسٹس ہوئے۔

[2] نواب عسکری حسن بھی حیدرآباد ہائیکورٹ کے جج اور پھر جوڈیشیل کمیٹی کے رکن ہوگئے تھے۔ آجکل حیدرآباد میں وکالت کرتے ہیں۔ حیدرآباد کی شکست کے بعد انھوں نے قاسم رضوی کی جانب سے مقدمات میں کچھ روز پیروی بھی کی۔ لیکن اُن کی طرزِ پیروی سے قاسم رضوی مطمئن نہیں تھے اور اسی وجہ سے آئندہ انھوں نے اُن کا وکالت نامہ منسوخ کردیا۔

بعد عبد العزیز ایڈووکیٹ کے ساتھ کام شروع کیا، لیکن طبیعت اور نقطۂ نظر کے اختلاف کے باعث اُنھیں جلد ہی اُن کا ساتھ چھوڑنا پڑا۔

ایک روز ہائی کورٹ کے اجلاسِ متعلقہ پر قاسم رضوی بحث کر رہے تھے۔ اجلاسِ عدالت کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مسئلہ بہت پیچیدہ تھا، جسے قاسم رضوی نے دلچسپ اور آسان کر دیا تھا، بحث ختم ہوئی، حاضرین نے تعریف کی اور ججوں نے داد دی۔ لیکن مولوی محمد علی فاضل ان کی صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے ان کو گلے لگا لیا اور خواہش کی کہ اُن کے ساتھ وہ کام کریں ——— محمد علی فاضل حیدرآباد کے سب سے زیادہ ذہین، ظریف، حاضر جواب اور ہر دلعزیز وکیل تھے اُن کا کردار بہت بلند اور خیالات نہایت پاکیزہ تھے۔ وہ قاسم رضوی کی معاملہ فہمی اور طرزِ پیروی کے مداح تھے، اور اُن کی صلاحیتوں کو ترقی دینا چاہتے تھے۔ اُنھیں اپنی پسند کا جونیر مل گیا تھا، اور قاسم رضوی مطمئن تھے کہ اُنھیں ایک نکتہ داں حاصل ہو گیا تھا۔! فاضل نے کامل اعتماد کے ساتھ اپنے سارے مقدمات اُن کے سپرد کر دئیے، اور اُنھوں نے بھی سخت محنت اور جاں فشانی سے اس اعتماد کو قائم رکھا۔

ایک روز فاضل کسی مثل کا مطالعہ کر رہے تھے اور کچھ بے چین نظر آتے تھے۔ دریافت پر قاسم رضوی کو معلوم ہوا کہ یہ ایک اہم مقدمہ ہے، لیکن اُن کی بازو بہت کمزور ہے، اور اسی سبب سے فاضل دو چار مہلتیں لے چکے ہیں۔ قاسم رضوی نے مثل پر ایک نظر ڈال کر کہا کہ اس

میں وہ خود بحث کریں گے، اور کامیاب نہ ہوں گے تو پیشۂ وکالت چھوڑ دیں گے۔ فاضل بہت پریشان ہوئے اور انھیں منع کرنے کی کوشش کی مگر قاسم رضوی کب ماننے والے تھے۔ دوسرے روز ہائیکورٹ کا اجلاس کامل شروع ہوا۔ فاضل کمرۂ وکلا میں بیٹھے رہے فریق مخالف کے وکیل کی بحث ختم ہوئی اور سب کو یقین ہو گیا کہ قاسم رضوی بازی ہار رہے ہیں۔ پھر انھوں نے اپنی بحث شروع کی۔ قدم قدم پر حکام نے سوالات شروع کئے، بڑی دیر تک مباحثہ ہوتا رہا، دلائل اور براہین پیش ہوئے، بالآخر بنچ خاموش ہو گیا اور بحث ختم کی گئی۔ حاضرین کی رائے متزلزل ہو گئی۔ قاسم رضوی خاموشی سے کمرۂ وکلا میں داخل ہوئے۔ فاضل کو پریشان کرنے کے لئے انھوں نے زیادہ سنجیدگی اختیار کی، اور غصہ کی صورت بنائے بیٹھ گئے — فاضل کو تشویش تھی کہ اُن کا ایک چہیتا ساتھی چھوٹا جا رہا ہے۔ اور حیدر آباد بار کو نقصان ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر میں چپراسی دستخط کے لئے فیصلہ لے آیا۔ قاسم رضوی نے حکم آخر دیکھا اور چپراسی کو جھڑک کر کہا کہ فاضل کے دستخط لے لو۔ فاضل کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

— قاسم رضوی کی جدائی کا تصوّر ہی کس قدر تلخ تھا، لیکن فیصلہ دیکھتے ہی وہ اپنی جگہ سے اُچھل گئے۔ قاسم رضوی کو گود میں اُٹھا لیا اور بار کے ایک ایک رکن سے ملایا، اُن کی ضد، ذہانت اور اداکاری کا سارا قصّہ مزے لے لے کر سنایا — اور رات کو فاضل کے ہاں

قاسم رضوی کے اعزاز میں ایک شاندار عشائیہ ترتیب دیا گیا!

تلاشِ معاش

قاسم رضوی اپنی خدمات کا کوئی معاوضہ فاضل کے اصرار کے باوجود حاصل نہیں کرتے تھے۔ فاضل نے اس بارے میں بڑی کوشش کی، مختلف تدبیریں اختیار کیں لیکن وہ ناکام رہے۔ قاسم رضوی کی عزتِ نفس اسے گوارا کرنے پر آمادہ نہیں تھی ـــــ لیکن انسانی ضروریات کو کب تک معرضِ التواء میں ڈالا جاسکتا ہے۔ اس عرصہ میں اُن کے ہاں دو بچے بھی تولد ہوئے اور ذمہ داریوں میں اضافہ ہوگیا۔ اس لئے قاسم رضوی نے حیدرآباد سے باہر کسی مناسب مقام پر اپنی علحدہ پریکٹس قائم کرنے کا تہیہ کرلیا۔ اُن کے ذہن میں شہر لاتور کا نام بار بار آتا رہا۔ کیونکہ اُن کے خسر ایک عرصہ تک عہدہ دار کوتوالی کی حیثیت سے وہاں رہ چکے تھے، اور اُن کی بیوی اس مقام سے بہت مانوس تھیں۔ لاتور ایک بڑا تجارتی اور صنعتی شہر ہے' اور اس کو ریاست حیدرآباد کی 'بمبئی' کہا جاتا ہے۔ آخر کار قرعۂ فال لاتور ہی پر پڑا، اور قاسم رضوی نے روانگی کی ایک تاریخ مقرر کی۔ دوستوں اور عزیزوں نے منع کیا، فاضل نے پوری توانائی صرف کی، اور جسٹس اصغریار جنگ نے انھیں یقین دلانا چاہا کہ اُن کی ہر طرح مدد کی جائے گی۔ لیکن قاسم رضوی کا فیصلہ اٹل تھا، وہ کسی شخص کے بھروسہ پر زندگی بسر کرنا نہیں چاہتے تھے۔ کسی نئے مقام پر پریکٹس قائم کرنے کے لئے کافی اثاثہ اور رقم

گنجائش کی ضرورت ہوتی ہے۔ لاتور کو روانہ ہونے میں صرف چھ
دن باقی تھے۔ حیدرآباد کے ایک ساہوکار شاہ پورجی کا بنگلہ لاتور
میں تھا، جس کو قاسم رضوی نے کرایہ پر حاصل کر لیا تھا۔ لیکن اُن
کے پاس اِس نوبت پر ایک حبہ تک نہیں تھا۔ فاضل سے یا اپنے
خسر سے وہ قرض بھی نہیں لینا چاہتے تھے۔ بہرحال ایک دوست
کو حال معلوم ہوا، اور اُس نے ایک ہزار روپیہ ایک لفافہ میں
بند کر کے اُن کی بیوی کے پاس بھیج دیا۔ قاسم رضوی نے لفافہ
کھولا تو یہ رقم اُنھیں ملی، لیکن اُس وقت پتہ نہیں چلا کہ اس کا
بھیجنے والا کون تھا۔

تاریخ مقررہ پر وہ لاتور روانہ ہوگئے[1]، دوسرے روز عدالت گئے
کچھ دیر اجلاس عدالت اور کمرۂ وکلاء میں بیٹھکر گھر لوٹ آئے۔ مکان
ایک عرصہ سے بند پڑا تھا، ہر طرف گرد اور مکڑی کے جالے
ہی نظر آتے تھے۔ اُنھوں نے پہلے اپنے نام کا بورڈ گھر پر لگایا اور
پھر نوکر کے ساتھ گھر کی صفائی شروع کی۔ ابھی صفائی جاری ہی تھی کہ
باہر کسی نے آواز دی، معلوم ہوا کہ حاجی عبداللہ نامی کوئی شخص
مقدمہ لے کر آیا ہے۔ قاسم رضوی نے ہاتھ منھ دھویا، جھٹ کپڑے

---

[1] لاتور میں ایک مرتبہ قاسم رضوی ہنس ہنس کر اپنے واقعات بیان کر رہے تھے۔ میں نے
اُن سے پوچھا کہ اگر یہ رقم آپ کو نہ ملتی تو آج آپ حیدرآباد ہی میں ہوتے۔ اُن کی پیشانی پر
بل پڑ گیا اور سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے اُنھوں نے کہا "روپیہ اگر نہ ہوتا تو سر پر اسباب
لادکر پیدل لاتور چلا آتا!"

بنے اور باہر نکل آئے ـــــــ حاجی عبداللہ لاتور کے ایک زمیندار اور بڑے مقدمہ باز ہیں۔ اُنھوں نے کاغذات بتائے، واقعات سمجھائے اور تین سو روپئے بطور محنتانہ پیش کئے ـــــــ! وکالت کی اِس طرح ابتدا ہوئی اور دن دُونی رات چوگنی ترقی ہوتی گئی۔ بڑے ساہوکار اور مختلف پارٹیاں اُن کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے اور بہت جلد فوجداری کے وہ سب سے بڑے وکیل بن گئے! اُنھوں نے بیوی بچّوں کو لاتور بُلالیا، اور شہر کے باہر طرزِ جدید کے ایک مکان کی تعمیر شروع کی۔

طلبہ میں ہردلعزیزی ہائی اسکول لاتور کے صدر مدرس دیوی چرن چیٹرجی کو اسپورٹس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، اور اس وجہ سے اسکول میں کوئی زندگی نہیں پائی جاتی تھی۔ لاتور میں قاسم رضوی نے اسپورٹس اور کھیلوں کی ابتداء کی، اسکول میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے، اور نوخیز طلبہ پروانہ وار اُن کے اطراف جمع ہو گئے۔ فٹ بال اور کرکٹ کے کھیل شروع ہوئے۔ قاسم رضوی کی ترغیب پر بعض عہدہ دار، اسکول کے اساتذہ اور خود چیٹرجی کھیلوں میں حصہ لینے لگے۔ مختلف اسکولوں اور اداروں سے میاچ ہونے لگے، اور پہلی مرتبہ لاتور کے طلبہ گلبرگہ شریف کی کُل ریاست ٹورنامنٹ میں شریک ہوئے۔ قاسم رضوی طلبہ کی ہر طرح ہمت افزائی کرتے رہے اور اُن

کی شخصیت طلبہ کے حوصلوں اور تمناؤں کا مرکز بن گئی۔ امیر، اور غریب طلبہ یکساں بے تکلفی سے اُن کے گھر جاتے اور وہ ہر ایک کو خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہتے۔ اُن کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ کھیلتی رہتی، اور اُن کی باتوں میں اس قدر کشش ہوتی کہ اُن کی صحبت میں ایک مرتبہ بیٹھنے کے بعد اُٹھ جانے کو کسی کا دل نہ چاہتا ——!

انجمن اعانت مسلم طلبہ دکن میں سات سو سال سے مسلم حکومت قائم تھی، لیکن ریاست حیدر آباد کے اضلاع بالخصوص قصبات اور دیہات کے عام مسلمانوں کی معاشی اور معاشرتی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ تجارت، زراعت اور دیگر تمام پیشے ہندوؤں کے ہاتھ میں تھے۔ شہر حیدر آباد کے مسلمانوں کا ذریعۂ معاش سرکاری ملازمت تھا، لیکن اضلاع کے مسلمان تو اس سے بھی محروم کر دیئے گئے تھے۔ عام طور پر اُن کی گزر بسر مزدوری اور خانگی ملازمتوں پر تھی، جس کے لئے وہ ہندوؤں کے دست نگر تھے۔ ان مسلمانوں اور پست اقوام میں اگر کوئی فرق تھا تو صرف اس قدر کہ موضع کی چاوڑی میں داخل ہو کر پٹیل[۱] پٹواری کے سامنے وہ بیٹھ سکتے تھے، اور پست اقوام کو اس کی اجازت نہ تھی! اس طرح

---

[۱] حیدر آباد میں پٹیل پٹواری موروثی ہوتے ہیں۔ پٹواری ہر جگہ برہمن اور پٹیل غیر مسلم ہوتا ہے۔ اس طرح حکومت کے دیہی نظام پر صدیوں سے ہندو چھائے ہوئے ہیں۔

فطرتاً اُن کی طرزِ زندگی، معاشرت اور اعتقادات پر ہندوؤں کا گہرا اثر تھا، اور بات چیت، شکل و صورت اور وضع قطع سے اُن میں اور ہندوؤں میں امتیاز کرنا کسی اجنبی کے لئے بہت مشکل امر تھا۔ —— یہ صورتِ حال مردِ مومن کے لئے سوہانِ روح تھی، اور اُس کے نزدیک اس کا واحد علاج تعلیم کی اشاعت تھا۔ لیکن غربت و افلاس میں تعلیم کا کیا محل تھا؟ کتنے ماں باپ ایسے تھے جو اپنے بچوں کو مدرسہ بھیج سکتے تھے اور کتنے ایسے تھے جو اپنے بچوں کا پیٹ ہی بھر سکتے تھے؟ مسئلہ بہت پیچیدہ تھا، قاسم رضوی کی کئی راتیں اسی کشمکش اور پیچ و تاب میں گذریں اور بالآخر اُنھیں اُمید کی ایک کرن نظر آئی —— اُنھوں نے اپنی ذات پر اعتماد کرکے ایک ادارہ انجمن اعانت مسلم طلبہ قائم کیا، اور اُس کے ماتحت ایک بورڈنگ ہاؤس اور ایک کتب خانہ بھی قائم کیا، جہاں نادار طلبہ کے قیام و طعام کا مفت انتظام تھا۔ ایامِ تعطیل میں وہ دیہاتوں کا رُخ کرتے، جہاں اُنھیں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا، وہ ذی حیثیت لوگوں سے اپیل کرتے اور بورڈنگ ہاؤس سے منھ مانگے غلّہ اُنھیں مل جاتا۔ انجمن کے لئے اُنھوں نے ایک پریس بھی خریدا جس کی آمدنی بورڈنگ ہاؤس کے لئے وقف تھی —— بہرحال قاسم رضوی کے انہماک سے انجمن اعانت مسلم طلبہ ایک مثالی انجمن بن گئی اور بیشمار خاندانوں کی فلاح اور نجات کا باعث ہوئی۔!

طائرِ لاہوتی حیدر آباد میں عدیدیت[1] (Oligarchy) نافذ تھی، برطانوی ہند کی عوامی تحریکات کا کوئی اثر ابھی تک حیدر آباد کی سیاست پر نہیں پڑا تھا۔ بڑے عہدے عام طور پر امراء اور درباریوں کا اجارہ تھے، اور بالعموم عہدہ دار نازک مزاج اور مغرور ہوتے تھے۔ رعایا سے اُن کا بہت کم ربط تھا اور چاپلوسی و خوشامد ہی مقصد برآری کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی۔ یہ صورتِ حال قاسم رضوی کی خودداری کے لئے سخت آزمائش تھی۔ بالخصوص اضلاع کے وکیلوں کے لئے خودداری کی حفاظت بہت مشکل امر تھا۔ عہدہ دار کی خفگی رزق کا دروازہ بند کرنے کا موجب ہو جاتی تھی — لیکن طائرِ لاہوتی نے پرواز کی کوتاہی کو کبھی گوارا نہیں کیا اور ہمیشہ رزق پر خودداری کو ترجیح دی —— میر یوسف علی منصف ہو کر آ گئے، وہ قاسم رضوی کے علیگڈھ کے ساتھی تھے۔ لیکن اقتدار کے نشہ میں چُور چُور اور عوام کے لئے فرعونِ بے سامان بنے ہوئے تھے۔ نظرتاً قاسم رضوی سے اُن کے شدید اختلافات پیدا ہو گئے، اور اجلاس پر اُن کی پیروی ممنوع قرار دی گئی۔ قاسم رضوی کی غیرتِ نفس نے غرور کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے سے انکار کر دیا، اور کارروائی ہائی کورٹ کے ایک رکن جسٹس اصغر یار جنگ کے سامنے پیش ہوئی

---

[1] چند سری حکومت، جس میں امراء ہی کا عمل دخل ہوتا ہے، اور عوامی رجحانات کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا۔

دونوں کے مباحث سماعت ہوئے۔ یوسف علی کو اُن کا مقام بتایا گیا، دوسری جگہ اُن کا تبادلہ کر دیا گیا اور کارروائی ختم ہوئی!

قاسم رضوی کی اس کامیابی سے لاتور میں پیشۂ وکالت کو وقار حاصل ہوا، عہدہ دار وکلاء کا لحاظ کرنے لگے، اور بنچ و بار میں تفاوت کم ہو گیا —— قاسم رضوی شاہراہِ ترقی پر گامزن تھے، ان کی پریکٹس میں ہر روز اضافہ ہی ہو رہا تھا۔ اور قدیم وکلاء مقابلہ کی دوڑ میں پیچھے ہوتے جا رہے تھے۔ قاسم رضوی نے زمینات خریدیں، مکان بنا لیا، اور دوسرے کاروبار میں روپیہ مشغول کیا —— لیکن یہ ترقی حاسدوں کے دل میں تیر بن کر چبھی اور اُن کے خلاف ایک سازش کی گئی۔ ۱۹۳۷ء میں عثمان جعفر جو ایک سینیئر وکیل کے دوست تھے، لاتور کے ناظم عدالت مقرر ہوئے۔ حاسدین کے گروہ نے اُن کے کان بھرے، بے بنیاد باتیں باور کرائیں، اور قاسم رضوی کے خلاف اُنھیں آلۂ کار بنا لیا۔ ایک روز کھلے اجلاس پر عثمان جعفر نے قاسم رضوی کی خودداری کو صدمہ پہنچانا چاہا۔ اس پر سخت گفتگو ہوئی اور تلخی شدت اختیار کر گئی۔ قاسم رضوی کے جوابات سے عثمان جعفر مغلوب الغضب ہو کر رونے اور چلّانے لگے، اور جب چیخ و پکار پر ملازمینِ عدالت اور فریقینِ مقدمہ جمع ہو گئے اور اُنھیں کچھ سجھائی نہ دیا تو وہ اجلاس سے اُٹھ کر چیمبر میں چلے گئے۔ اس کے بعد قاسم رضوی نے اُن کے اجلاس پر جانا ترک کر دیا۔ اُن کے

سارے مقدمے ایک ایک کر کے خراب کئے گئے، اور اُن کی آمدنی کا ایک دروازہ بند ہو گیا۔ ایک عرصہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ بعض لوگوں نے مفاہمت کی کوشش کی، لیکن "مفاہمت تو انسانوں سے کی جاتی ہے"۔۔۔۔۔۔ اقتصادی مجبوریاں، معاشی دشواریاں اور خود عثمان جعفر کے پیامات بھی اُنھیں مفاہمت کے لئے آمادہ نہ کر سکے۔ وہ اپنے فیصلہ پر اڑے رہے۔ یہاں تک کہ عثمان جعفر کا تبادلہ کرانے میں وہ کامیاب ہو گئے!



باب چہارم

سیاسی زندگی کی ابتدا

بحرِ سیاست کے طوفان انگریزوں کی حکمتِ عملی[1] نے برطانوی ہند کی فضا کو مسموم کر کے فرقہ وارانہ بھائی
چارے کو چتا پر جلا دیا تھا۔ لیکن حیدر آباد اِن تباہیوں سے عرصہ
تک محفوظ رہا، اور برطانوی ہند کی تخریبی کارروائیاں دکن کی امن
پسند رعایا کو متاثر نہ کر سکیں۔ یہ صورتِ حال واردھائی فکر کے
معائر اور مہاسبھائی تمناؤں کی راہ میں حائل تھی۔ چنانچہ ویدانت
کے "محافظین" نے ریاست حیدر آباد کے اطراف طلسمی جال بچھا دیئے
اور ویدک دھرم کے تحفظ اور آریہ سماج' کے پرچار کی آڑ میں تعصب
اور مسلم دشمنی کو ۱۹۳۵ء میں حیدر آباد کی حدود میں داخل کر دیا۔
فضا، دن بدن مکدر ہوتی گئی۔ شدید فسادات پھوٹ پڑے۔ شہر
حیدر آباد میں دھول پیٹھ کا سنگین ترین حادثہ پیش آیا۔ نواب
بہادر یار جنگ کے بھانجے شہید کیے گئے اور ملک میں صورتِ حال

۱؎ تقسیم کرو اور حکومت کرو۔

نازک ہوگئی ـــــ اس تحریک کا سب سے بڑا مرکز شولاپور تھا اور قربت کے سبب سے اس کی راست ضرب لاتور پر پڑ رہی تھی۔ لیکن اس نازک دور میں لاتور اور مرہٹواڑہ کے مسلمانوں کا ملجا و ماوی کون ہوسکتا تھا؟ نواب بہادر یار جنگ کی نگاہ مردم شناس قاسم رضوی پر پڑی، اور اُنھوں نے اپنے ایک مکتوب مؤرخہ ۲۔ فروری ۱۹۳۵ء کے ذریعہ ان بے بس مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کو قاسم رضوی کے سپرد کردیا۔

اعجازِ نظر رام لنگ[1] کے مندر میں ایک جلسہ ہوا۔ شولاپور کے سادھوؤں نے مسلمانوں کے مظالم کی داستانیں بیان کیں۔ ہندوؤں میں غیظ و غضب کی لہر دوڑ گئی، اور آریہ سماج کے ہزاروں مسلح سپاہی لاتور کی ملیچھ سرزمین کو مسلمانوں کے خون سے پوتر کرنے کے لئے باہر نکل گئے۔ سارے شہر میں اس کی اطلاع آگ کی طرح پھیل گئی۔ یہ توحید کے علمبرداروں کا امتحان تھا۔ کفن بردوش مسلمانوں کا سیلاب رام لنگ کی طرف بڑھتا گیا۔ پولیس پریشان تھی، مجسٹریٹ سراسیمہ تھے۔ اُنھیں یقین تھا کہ آج خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔ لیکن مسلمانوں کے قلوب پر قاسم رضوی کی گرفت کا کسی کو اندازہ نہیں تھا ـــــ قاسم رضوی اس سیلاب کی

---

[1] رام لنگ لاتور کا ایک بڑا مندر ہے جو ہمیشہ آریہ سماجی اور سیاسی کارروائیوں کا مرکز رہا ہے۔

راہ میں حائل ہو گئے۔ اُن کے ابرو کے ایک اشارہ سے شہر کی اینٹ سے اینٹ بج سکتی تھی۔ لیکن مسلمانوں کا سارا جوش اور سارا غصہ قاسم رضوی کی نگاہوں میں جذب ہوتا گیا۔ مشتعل مجمع کی روح قاسم رضوی کی مٹھی میں آگئی، خوفناک جلوس اُن کے ہاتھ میں ایک آلۂ بے جان ہو گیا، اور جس طرح آیا تھا اُسی طرح منتشر ہو گیا!——

—— اور پھر قاسم رضوی رام لنگ کی طرف بڑھے۔ کوئی اُن کے ساتھ نہ تھا، منگل دیو کی آنکھوں سے چنگاریاں جھڑ رہی تھیں، اور سماجیوں کے دل میں شعلے دہک رہے تھے —— لیکن قاسم رضوی کو دیکھکر یہ ہیبت ناک مجمع سہم گیا، گویا کسی نے افسوں پھونک دیا۔ منگل دیو نے آگے بڑھکر ہاتھ ملایا —— اور قاسم رضوی زندہ باد کا نعرہ رام لنگ کے کلس سے ٹکرایا۔!!

مجلس اتحاد المسلمین

شر کے بطن سے خیر پیدا ہوتا ہے۔ آریہ سماجی شر سے حسنِ خیر عالم آشکار ہوا۔[1] فسادات کے دھماکوں سے دکن کا خوابیدہ مسلمان بیدار ہوا اور برہمنیت کی عیاریوں نے اُن میں ایک مرکزیت پیدا کر دی۔ مجلس اتحاد المسلمین کو حیاتِ نو نصیب ہوئی۔ ملک بھر میں اُس کی شاخیں قائم ہوئیں۔ نواب بہادر یار جنگ

---

[1] قاسم رضوی کا ایک شعر ہے:

شر سے حسنِ خیر عالم آشکار　　　شر عروسِ خیر کا ادنیٰ سنگھار

مملکتی مجلس کے صدر منتخب ہوئے، اور اُن کے اعجازِ خطابت نے نیم مردہ قوم میں نئی روح پھونکی۔ اُنھوں نے اپنی عاملہ میں قاسم رضوی کو شامل کیا، جہاں وہ ۱۹۴۶ء تک رہے جبکہ وہ خود مملکتی مجلس کے صدر منتخب ہوئے۔ قاسم رضوی کو لاتور کی مجلس نے بھی اپنا صدر منتخب کیا، اور ۱۹۴۶ء میں شہر حیدرآباد کو منتقل ہونے تک وہ اس مجلس کے صدر رہے۔

نواب بہادر یار جنگ کی فراست اور اُن کے شرکار کار کے خلوص سے مجلس مقبولِ عام اور مسلمانوں کی واحد نمایندہ جماعت ہوگئی۔ اُنھوں نے مجلس کو اپنے خونِ جگر سے سینچا، اور اُس کی جڑیں اس قدر مضبوط ہوگئیں کہ انڈیا یونین کے حملہ تک حیدرآباد میں مسلمانوں کی کوئی اور سیاسی جماعت قائم نہ ہوسکی۔

اعلانِ جنگ

واردھا اور شولاپور سے آریہ سماج تحریک کی آبیاری جاری تھی، قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کے تحت مہاسبھائی جھنڈا سات صوبوں پر لہرا رہا تھا۔ اور اب ریاست حیدرآباد کی باری تھی۔

مجلس اتحادالمسلمین ہندوؤں کی جائز تمناؤں کو روندنا نہیں چاہتی تھی، اس لئے نواب بہادر یار جنگ نے اُن سے گفتگوئے مفاہمت شروع کی۔ مسٹر نرسنگ راؤ ایڈیٹر "رعیت" نے ہندوؤں سے خطِ اعتماد حاصل کیا، اور چودہ نشستوں میں سوائے مسئلۂ زبان کے بقیہ سارے

مسائل طے ہوگئے، اور اب فریقین کے دستخط ہونے باقی تھے کہ
اربابِ حکومت کی آنکھوں میں موت رقص کرنے لگی۔ انھوں نے اپنی
بقا کے لئے ملک میں دستوری اصلاحات کا اعلان کیا، اور اس بارے
میں سفارشات کے لئے "اینگار کمیٹی" کا ڈھونگ رچایا۔ اس اعلان نے
برادرانِ وطن کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ اور دوسری طرف وارِ دھائی
سیاست میں پھر طوفان اُمڈ آیا ——— آریہ سماج اور ہندو مہاسبھا
نے اسٹیٹ کانگریس اور پھر ہندو سیول لبرٹیز یونین کا بھیس بدلا،
ہندو پریس نے آسمان کو سر پر اُٹھا لیا، اور ہندوؤں پر مظالم کے
حیرت انگیز افسانے بیان کئے۔ اسٹیٹ کانگریس نے شرانگیز پروپگنڈہ
شروع کیا، اور حکومت نے مجبوراً اُس کو ممنوعہ ادارہ قرار دیا، بیرونِ وار دھا
سے مشورہ ہوا اور ستیاگرہی جنگ کا اعلان کر دیا گیا۔ حیدر آباد کی
سرحدوں پر بندے ماترم کا شور ہوا۔ مختلف مراکز سے فوجیں آگے بڑھیں
سر اکبر حیدری کی حکومت گھبرا گئی اور اُس نے اس فوج کے آگے
ہتھیار ڈال دیئے ——— مردِ مجاہد نے لاتور سے احتجاج کیا۔ حکومت
کی اس بزدلی کے مہلک اثرات اضلاع پر مترتب ہو رہے تھے۔
مجلس نے زور باندھا اور نواب بہادر یار جنگ نے مسلمانوں کی شمعِ
اقتدار کو آندھیوں سے بچانے کے لئے پندرہ لاکھ پروانوں کا
ایک حلقہ قائم کر دیا۔ مہاراجہ سر کشن پرشاد (سابق وزیرِ اعظم)
نے ستیاگرہ کے خلاف ایک بیان جاری کیا اور اس کو "بیرونی مفسدہ پردازی"

پر محمول کیا۔ لیکن قوم پرستوں نے حکومت کے اشارہ پر ۲۸۔ اپریل ۱۹۳۹ء

کو اعلان دستور اصلاحات پر اظہار اطمینان کے لئے زمرد محل میں

ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا۔ قرارداد پر تقریریں ہوئیں، اور پھر

صدرِ جلسہ نے نواب بہادر یار جنگ سے تائیدِ مزید کی خواہش کی۔ نواب

صاحب نے موقع سے فائدہ اُٹھایا اور التوائے اصلاحات کی ترمیم

پیش کر کے اپنی ساحرانہ صلاحیتوں سے نعرہ ہائے تکبیر کی گونج

میں منظور کرالیا ـــــ حکومت کو عوامی رجحانات کا احساس ہوا

لیکن اینگار کمیٹی کا کام برابر جاری رہا!

مجلس کی تجاویز

اینگار کمیٹی کے سامنے پریس اور عوام کی جانب سے تجاویز پیش ہو رہی تھیں۔ مجلس نے بھی

اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی اور دنیا پر یہ ظاہر کر دیا کہ وہ کوئی

رجعت پسند جماعت نہیں ہے۔ بلکہ ہر مذہب و ملت کی ترقی

اور جائز تمناؤں کی نقیب ہے۔ اس سلسلہ میں مجلس نے مارچ

۱۹۳۹ء میں حکومت کے سامنے ایک اہم یادداشت پیش کی،

جس کے اہم نقاط درجِ ذیل ہیں :۔

(۱) حیدرآباد کی حکومت ایک مقتدر بادشاہت ہو جس پر خاندانِ آصفی

کا ایک رکن متمکن رہے۔

(۲) ہندوستان کے وفاقیہ میں اگر شرکت ناگزیر ہو تو صرف ایسی

صورت میں شرکت کی جائے کہ اس کا سیاسی اقتدار اور مالی توازن

باقی رہے.

(۳) مسلمان کسی ایسے دستور کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہیں جس سے ان کی تاریخی اور روایاتی سیاسی برتری متاثر ہو.

(۴) مقننہ اور حکومتِ خود اختیاری کے اداروں میں مسلمانوں کو آئینی اکثریت حاصل رہے.

(۵) مسلمانوں کا جداگانہ انتخاب عمل میں آئے.

(۶) کوئی مسودۂ قانون جو کسی مذہب پر مؤثر ہو، اُس وقت تک منظور نہ کیا جائے، جب تک کہ اُس فرقہ کی پچھتر فیصد اکثریت تائید نہ کرے.

(۷) سرکاری زبان اُردو باقی رہے.

(۸) سرکاری ملازمتیں فرقہ وارانہ تناسب کی بنا پر تقسیم نہ کی جائیں کیونکہ مسلمانوں کا ذریعۂ معاش محض سرکاری ملازمت ہے.

(۹) ہر مذہب و ملت کو آزادی اور ہر شخص کو شہری حقوق حاصل رہیں.

(۱۰) چونکہ حیدرآباد ایک مسلم مملکت ہے اس لئے خدمات شرعیہ کے لئے عہدۂ صدر الصدور علیٰ حالہ قائم رہے.

(۱۱) چونکہ اہم پیشوں، تجارت، زراعت، صنعت میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں ہے، اور اُن کی معاشی حالت خراب ہے، اس لئے اُن کی اقتصادی مشکلات کو رفع کرنے کی تدبیریں اختیار کی جائیں.

(۱۲) ہر ضلع میں صوبہ دار کی زیر صدارت ہر سال ضلع کانفرنس منعقد ہو جس میں عوام اپنی ضروریات اور مشکلات پیش کر سکیں۔

(۱۳) وزرار کے ساتھ غیر سرکاری اراکین کی مشاورتی کمیٹیاں قائم کی جائیں تاکہ ہر کارروائی عوامی نقطۂ نظر سے کی جا سکے۔

لیکن سر اکبر حیدری کی مرعوب ذہنیت والی حکومت نے مجلس کی طرف سے اغماض برتنا شروع کیا۔ اور مجلس میں رخنہ ڈالنے کی ناکام کوشش کی۔ جس سے سر اکبر کے خلاف مظاہرے شروع ہوئے، اور کمیٹی کی رپورٹ کی اشاعت کا مطالبہ کیا گیا۔ حکومت نے ابتداءً ٹال مٹول کیا، لیکن بالآخر جولائی ۱۹۳۹ء میں اُسے رپورٹ شائع کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

اینگار کمیٹی کی سفارشات

اینگار کمیٹی میں جو مسلمان شامل کئے گئے تھے، اُن پر عام مسلمانوں کو اعتماد نہیں تھا۔ وہ سر اکبر کے اشارات اور مسٹر اینگار کی ہدایات پر کام کرتے تھے، اور اسی سبب سے انھیں اس کمیٹی میں رکھا گیا تھا۔ نیتجتاً اس کمیٹی نے وہی کیا جو مسٹر آینگار چاہتے تھے۔ کمیٹی نے سفارش کی کہ:۔

(۱) مقننہ ایک ایوانی ہو۔

(۲) مقننہ میں علاقہ واری نمائندگی (Territorial Representation) کے بجائے مفاداتی نمائندگی (Functional representation) ہو

(۳) اراکینِ کابینہ کے علاوہ مقننہ جملہ ستر اراکین پر مشتمل ہو، جس میں سینتیس[۳۷] نامزد شدہ ہوں اور تینتیس[۳۳] کو مختلف مفادات کے نمائندہ ادارے منتخب کریں۔

(۴) طریقۂ انتخاب مشترک ہو

کمیٹی نے مقننہ میں مسلمانوں کے لئے نشستوں کا تحفظ نہیں کیا تھا، اور چونکہ ہر پیشہ میں ہندوؤں کی بڑی اکثریت تھی اس لئے مسلمانوں کی تعداد کا ناقابل لحاظ ہو جانا لازمی امر تھا۔ اس طرح مسلمانوں کی تاریخی اور سیاسی اہمیت کو بالکل نظرانداز کر دیا گیا تھا

مجلس اتحاد المسلمین نے کمیٹی کی سفارشات کے خلاف باقاعدہ مہم شروع کی۔ حکومت کو مجلس کی طاقت کا احساس ہو گیا اور اُس نے کمیٹی کی تمام سفارشات کو منشورِ اصلاحات میں شامل کرنے کی جرأت نہیں کی۔

منشورِ اصلاحات حکومت نے اعلان کیا کہ مقننہ پچاسی اراکین پر مشتمل ہو گی، جن میں کابینہ کے سات اراکین، صرفِ خاص[۱] کے تین، نامزد شدہ اٹھائیس، منتخب شدہ بیالیس، اور علاقہ جات کے پانچ اراکین ہوں گے۔ منتخب شدہ اراکین مفادات کی

---

[۱] صرفِ خاص سلطنت حیدرآباد کا وہ علاقہ تھا جو نظام کے ذاتی خرچ کے لئے علیحدہ کر دیا گیا تھا دوسرے علاقہ کو "علاقۂ دیوانی" کہا جاتا تھا۔ حیدرآباد کی شکست کے بعد صرفِ خاص کو دیوانی میں شامل کر دیا گیا، حالانکہ شکست سے قبل صرفِ خاص کے انتظامات کے متعلق معمولی تنقید بھی نظام کے نزدیک غداری کے مترادف تھی۔

نمائندگی کریں گے، اور ہر مفاد میں مسلمانوں کو پچاس فیصد نمایندگی دی جائے گی۔ نامزد شدہ اراکین میں پانچ ہریجن، ایک لنگایت، دو عیسائی، ایک پارسی اور دو خواتین کے نمایندے ہوں گے۔

حکومت نے اس امر کی وضاحت کر دی کہ مسلمانوں کی تاریخی اہمیت کے مدنظر انھیں اقلیت کی گھٹی ہوئی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ فرمان شاہی میں حیدر آباد کو "مسلم ریاست" لکھا گیا۔

تیقنات لیکن بحیثیت مجموعی ایوان میں مسلمان عملاً اقلیت میں آ رہے تھے اس لئے مجلس نے معلنہ منشور کے خلاف سخت احتجاج کیا، اور حیدری حکومت کو راست عمل (Direct Action.) کا الٹی میٹم دے دیا۔ ہندوؤں نے بھی اصلاحات کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ اور اس طرح سیاسی تعطل پیدا ہو گیا۔ مسلمانوں کا مقدمہ **قائدِ اعظم** کے سامنے پیش ہوا۔ حکومت نے اُنھیں حیدر آباد آنے کی دعوت دی، اور اُن کی تجاویز کی بنا، پر **نظام** نے مجلس کو ذریعۂ مکتوب تیقنات دیئے کہ پائیگاہوں[1] کے تین اور صرف خاص کے تین نامزد شدہ اراکین ہمیشہ مسلمان ہی ہوں گے **قائدِ اعظم** کی بصیرت سے مجلس کو شاندار کامیابی ہوئی اور اُس نے اصلاحات کو منظور کر لیا۔

مسلمانانِ دکن کا سیاسی مؤقف اورنگ زیب عالمگیر کے بعد

---

[1] حیدر آباد کی تین بڑی جاگیریں تھیں، جو آمدنی اور رقبہ کے لحاظ سے ہندوستان کی اکثر دیسی ریاستوں سے بڑی تھیں۔

خاندانِ مغلیہ کے نا عاقبت اندیش ورثاء کے ہاتھوں میں دکن کا اقتدار غیر محفوظ ہوگیا تھا، اور وہ پودا جس کی عالمگیری فراست نے آبیاری کی تھی اب مرجھا رہا تھا۔ سلطنتِ مغلیہ زندگی کے آخری دور میں تھی، اور صورتِ حال نازک ہوگئی تھی۔ اِن حالات میں عالمگیر کے ایک شاگرد آصف جاہ نے دکن میں مسلمانوں کے اقتدار کے تحفظ کے لئے ایک آزاد اور خودمختار سلطنت کی بنا رکھ ڈالی، اور مسلمانوں نے اس کو اپنے خونِ جگر سے سینچا اور اپنی ہڈیوں پر اس کی بنیادوں کو مستحکم کیا، اور اس طرح دکن کی یہ سلطنت مسلمانانِ ہند کے اقتدار کی ایک نشانی اور اُن کی آرزوؤں اور تمناؤں کا مرکز بن گئی —— یہی وہ حقیقت ہے جو دکن میں مسلمانوں کے سیاسی مؤقف کی بنیاد ہے' اور اسی سبب سے مجلس نے اعلان کیا کہ :۔

"مسلمان من حیث القوم اس ملک کے بادشاہ ہیں۔ اعلیٰحضرت کا تخت و تاج مسلمانوں کے سیاسی و تمدنی اقتدار کا مظہر ہے وہ ہماری بادشاہت کی روح ہیں، اور ہم اُن کی بادشاہت کے جسم۔ وہ نہیں تو ہم نہیں اور ہم نہیں تو وہ نہیں۔"

یہ مسلمانوں کی سیاسی حیثیت کا اعلان تھا، اُن کی تاریخ کا نچوڑ اور اُن کے اس عزم کا مظہر تھا جو آئندہ اُن کی ساری جدوجہد کا محور بن گیا!

صدیقِ دکن مسلمانوں کے سیاسی مؤقف کے تحفظ کے لئے

مجلس اتحادالمسلمین نے بڑے پیمانہ پر عوامی تحریک شروع کی۔لیکن غریب مسلمانوں کی اس سیاسی جماعت کی اقتصادی حالت بھی خراب تھی، جس کے باعث اہم اُمور کی تکمیل میں بڑی دشواری محسوس ہو رہی تھی۔اس لئے نواب بہادر یار جنگ نے چندہ کی اپیل کی،لیکن امراء اور دولتمندوں پر اس اپیل کا کوئی اثر نہ ہوا۔چنانچہ اُنہیں اضلاع کے دورہ کی ضرورت لاحق ہوئی ــــــ ۱۲۔جون ۱۹۳۹ء کو گلبرگہ شریف کے ایک عظیم الشان اجتماع میں اس مطربِ آتش نوا نے اس انداز سے نے نوازی شروع کی کہ پتھر کے دل پگھل گئے، اور بدمستوں نے اپنے گریبان چاک کر ڈالے۔

"آشیانہ کو آگ لگ رہی ہے اور وہی پتے ہوا دے رہے ہیں، جن پہ تکیہ کیا گیا تھا۔یہی وقت آپ کے شعور و فہم کی آزمایش کا ہے،آپ کے جذبۂ ایثار کی آزمائش کا.....

.....آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے ایک بیدار ملت کا شعور صدیقؓ کے سوز میں نمایاں ہو گیا تھا۔لیکن کیا آج اس ملت کو حالت کی نزاکت کا احساس نہیں ہے؟

ــــــ کیا ہماری صفوں میں کوئی صدیق نہیں ہے......؟"

دل سے ایک بات نکلی اور دل پر اثر کر گئی۔رندکے دل کی دھڑکن قلندر کے سوزِ نفس میں جذب ہو گئی!ــــــ قاسم رضوی حالتِ اضطراب میں جلسہ گاہ سے باہر نکل آئے۔اپنی تمام جائداد

— منقولہ اور غیر منقولہ — نقد — کتابوں، کپڑوں اور برتنوں کی ایک فہرست مرتب کی، اور لوٹ کر خطیبِ شعلہ نوا کے ہاتھ میں دے دی! اُس نے پوچھا "بچوں کے لئے کیا چھوڑا ہے؟ جواب ملا" اللہ اور اُس کے رسول کا نام!"

مجمع پر رقت طاری ہو گئی، اور بھرائی ہوئی آواز میں بہادر یار جنگ نے کہا:-

"اے صدیقِ دکن[1]! اے ملت کے گہر، موتی کی آب!
اے سوزِ صدیق کی آبرو! تو نے ملتِ اسلامیہ کی
لاج رکھ لی........!!!

انگریز سے مطالبہ - ۱۹۳۹ء میں جنگ عظیم شروع ہوئی۔ ہندوستانی سیاست میں رسہ کشی جاری تھی، انگریز اپنے داؤ پر تھے، کانگریس ہندو راج چاہتی تھی اور مسلم لیگ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے کوشاں تھی۔ اس طرح قوتوں کا ایک مثلث قائم ہو گیا تھا، اور ہندوستان کی بساطِ سیاست پر نئے نئے کھیل کھیلے جا رہے تھے۔

برطانوی حکومت نے اعلان کیا کہ جنگ کے اختتام پر قانونِ ویسٹ منسٹر کے مطابق ہندوستان کو مقبوضاتی درجہ دیا جائے گا،

---

[1] اس کے بعد ساری قوم قاسم رضوی کو "صدیقِ دکن" ہی کہنے لگی۔ اُن کی تمام جائداد مجلس کو وقف ہو گئی، جس کے لئے ایک رسیور مقرر کیا گیا۔

لیکن ریاستوں کے متعلق کوئی واضح بات بیان نہیں کی گئی۔ حیدری حکومت کو بھی حیدر آباد کے مستقبل کی کوئی فکر نہیں تھی۔ دراصل مجلسِ وزراء بوڑھی ہو چکی تھی اور عہدِ حاضر کے تازہ فطری رجحانات اور صحیح عملی جذبات سے محروم تھی۔ وہ ملک کے قلب و دماغ کی کیفیات اور حالاتِ حاضرہ کی رفتار کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتی تھی ــــ قاسم رضوی نے حیدر آباد کے آئندہ بین الاقوامی سیاسی و دستوری مؤقف کا سوال مجلس میں اُٹھایا۔ اور اگست سنہ ۱۹۴۷ء میں مجلس نے ایک یاد داشت حکومت کے سامنے پیش کی کہ:-

(۱) حکومتی افواج میں توسیع کی جائے، اور اسلحہ سازی کے کارخانے قائم کئے جائیں۔

(۲) برطانیہ سے مطالبہ کیا جائے کہ امدادی افواج برخاست کر کے مفوضہ علاقہ جات حیدر آباد کو واپس کر دے۔

(۳) داخلی و خارجی آزادی کے تیقن کے ساتھ برطانیہ سے مستقل دوستانہ تعلقات قائم کئے جائیں۔

لیکن حکومت پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا، اور مجلس نے مجبوراً وزراء کی تبدیلی کے لئے ایک قرارداد پیش کی، اور شدت سے مطالبہ کیا کہ "خود بیں و انگریز آگاہ" افراد کے بجائے "خود آگاہ و خدا بیں" وزراء کا تقرر کیا جائے۔ ــــ اس قرارداد سے دلکشا میں زلزلہ پڑ گیا، اور شملہ میں غیض و غضب کا طوفان بپا ہو گیا۔ جنگ کے دوران

میں جبکہ عام رجحان انگریزوں کے خلاف تھا، عوامی عناصر کی حکومت حیدرآباد میں شمولیت انگریز کس طرح برداشت کر سکتے تھے؟

نزولِ عتاب ۳۱۔ دسمبر ۱۹۴۲ء کو حکومت برطانیہ کی جانب سے حیدرآباد کے ولیعہد پرنس آف برار کو "نائٹ آف دی گرانڈ کراس آف دی موسٹ ایکسلنٹ آرڈر آف دی برٹش امپائر" کا خطاب دیا گیا۔ مجلس نے اس کو حیدرآباد کی آزاد حیثیت کی توہین تصور کیا۔

۶۔ جنوری ۱۹۴۳ء کو صدر مجلس بہادر خاں نے اس کے خلاف بیان جاری کیا۔ انگریزوں نے مجلس کو ایک باغی ادارہ سمجھا، اور ایک سال کے لئے نواب صاحب کی زبان بندی کے احکام صادر ہوئے۔ نواب صاحب نے اپنا خطاب اور جاگیر بھی نظام کو واپس کر دی۔ لیکن رفتہ رفتہ انگریزوں کی غلط فہمیاں دور ہوتی گئیں — "ہندوستان چھوڑ دو" (Quit India) کی تحریک میں مسلمانوں نے کوئی حصہ نہیں لیا۔ بلکہ مجلس نے اس کو بزدلی سے تعبیر کیا اور مسلمانوں کے خلاف ایک سازش قرار دیا۔ مجلس نے اعلان کیا کہ ہم جنگی مساعی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرنا چاہتے۔

اسی اثناء میں وائسرائے کے مشیر سیاست سر فرانسس وائلی سے بہادر خاں نے ملاقات کی اور اپنا نقطہ نظر اس طرح واضح کیا کہ بہ حیثیت ہندوستانی فطرتاً وہ انگریزی تسلط کے خلاف ہیں، لیکن جہاں تک کہ حیدرآباد کی سیاست کا تعلق ہے وہ انگریزوں کی دوستی کو مفید

و مناسب سمجھتے ہیں۔ سر فرانسس اس گفتگو سے بہت متاثر ہوئے اور اُنھوں نے اپنی حکومت کا زاویۂ نگاہ بدل دیا۔

فریب نظر ۱۹۴۱ء میں ملک کی عام فضا، سر اکبر کے خلاف تھی اور اپنی نیک نامی کے لئے اُن کی ہر کوشش ناکام ہو چکی تھی۔ اس لئے وہ اپنے عہدے سے سبکدوش ہو کر وائسرائے کی کونسل میں چلے گئے۔ اُن کی جگہ اس منصبِ جلیلہ پر ایک حافظِ قرآن، قرآنی لبادہ اوڑھے ہوئے نمودار ہوا۔ اُس کے لبوں پر قرآن تھا اور وہ قرآنی فکر کا دعویدار تھا۔ مسلمانوں نے اسے فالِ نیک اور اپنی نشأۃِ ثانیہ کے لئے پیامِ جاں فزا تصور کیا ——

لیکن یہ فریبِ نظر تھا۔ واقعات نے ثابت کیا کہ حافظ قرآن سر احمد سعید خاں چھتاری کے لب پر آئے ہوئے الفاظ اُن کے دل سے نہیں نکلے ہیں، اور مرورِ زمانہ نے یہ بتایا کہ مسلمان دھوکا کھا چکے ہیں —— لیکن کب؟ —— اُس وقت جبکہ چڑیاں کھیت چُگ گئی تھیں! جبکہ تیر کمان سے نکل چکا تھا!!

حافظ احمد سعید چھتاری کے تمام مفادات ہندوؤں سے وابستہ تھے، اُن کی جاگیر، اُن کی دولت، اُن کی دُنیا یو۔ پی میں تھی، جہاں کانگریس راج رہ چکا تھا، اور آئندہ لازمًا قائم ہونے والا تھا۔ مسلمانوں نے "مایۂ خویش" کو اُن کے سپرد کرنے اور اپنی اُمیدوں کو اُن سے وابستہ کرنے میں سخت غلطی کی۔ دراصل چھتاری کا دورِ حکومت حیدرآباد کی

بنیادوں کو مضبوط اور اُس کے سیاسی مؤقف کو مستحکم کرنے کے لئے سازگار ہوسکتا تھا۔ کانگریس جیل میں تھی اور اُس کی تخریبی کارروائیوں کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ انگریز مسلمانوں کے ممنونِ احسان تھے۔ بالخصوص حیدر آباد نے اپنے سارے وسائل جنگ کی کامیابی کے لئے وقف کردئیے تھے۔ مسلمانانِ دکن اپنے عزائم اور خواہشات کا اظہار کرچکے تھے، اور مسلمانانِ ہند کی اُنھیں مکمّل تائید حاصل تھی ——— ہندوستان کے لئے مقبوضاتی درجہ کا اعلان ہوچکا تھا اور حیدر آباد کے مستقبل کا مسئلہ بڑی خوبی سے سلجھایا جاسکتا تھا۔ اسلحہ سازی کے کارخانوں کے قیام، افواج کی توسیع اور مفوضہ علاقہ جات کی واپسی کا سودا انگریزوں سے طے کیا جاسکتا تھا۔ ایک نجی گفتگو میں حیدر آباد کے انگریز رزیڈنٹ نے بھی وضاحت کردی تھی کہ برار کے عوض مچھلی پٹم کی بندرگاہ کی واپسی ممکن بھی ہے، اور حیدر آباد کے لئے مفید بھی۔ دولت کی حیدر آباد میں کمی نہیں تھی اور ذرا سی دانشمندی، ذرا سی دیانت حیدر آباد کے "جزیرہ" کو ایک طاقتور سلطنت میں تبدیل کرسکتی تھی، اور دکن کے مسلمانوں کی تقدیر کو بدل سکتی تھی! ——— لیکن چھتاری نے اپنے فرائض سے گریز کیا اور مجرمانہ ترکِ فعل سے اپنے ماضی اور مستقبل کے آقاؤں کی بہت بڑی خدمت انجام دی!

التوائے اصلاحات ۔ جنگِ عظیم جاری تھی ۔ ملک کے سارے وسائل

انگریزوں کے لئے وقف تھے اور جنگ کی مساعی کو تیز تر کیا جا رہا تھا، اس لئے اصلاحات کے نفاذ، انتخابات کے ہنگاموں اور حکومت کی مشینری میں عمومی اثر کی شمولیت کو ملتوی کر دیا گیا۔ لیکن تبدیلیٔ وزرار کا مطالبہ اپنی جگہ قائم تھا جس کو مسٹر غلام محمد[۱] کی اخلاقی تائید حاصل تھی۔ مسٹر غلام محمد جو عوامی ماحول سے متاثر اور ترقی پسند رُجحانات کے حامل تھے، اسی اثناء میں حیدرآباد کے وزیرِ خزانہ مقرر ہوئے تھے۔ نواب بہادر خاں سے ان کے گہرے مراسم تھے، اور اس وجہ سے انھیں یقین تھا کہ کابینہ میں مجلس کے نمایندے کی شرکت اُن کے دست و بازو کو طاقتور کر سکے گی ـــــ بالآخر نظام کو مجلس کے مطالبہ کے آگے جھکنا پڑا، اور اُس نے طے کیا کہ نواب بہادر خاں کو شجیع الملک کا خطاب دے کر کابینہ میں شامل کر لیا جائے۔

المیہ سازش حیدرآباد کی درباری سیاست کا ہمیشہ سے محور رہی ہے۔ مجلس کی ترقی حیدرآباد کی حکومت کے اجارہ داروں کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگی۔ سازشوں کی روح بیدار ہوئی اور ـــــ ایک دعوت میں بیٹھے کلامِ اقبال پر تبصرہ کر رہے تھے کہ نواب بہادر خاں کو حقّہ پیش کیا گیا، جس کے دو کش نے اس دیوہیکل انسان کا کام تمام کر دیا۔! غالب شہادتیں اس امر کی موجود ہیں کہ اُنھیں زہر دیا گیا ـــــ رجعت پرست عناصر

---

[۱] فضیلت مآب غلام محمد گورنر جنرل پاکستان دیکھئے ص ۶۲ پر

اُن کی جد و جہد سے خائف تھے۔ ہندوؤں کا اعتماد اُنھیں حاصل ہوتا جا رہا تھا۔ پنڈت راما[1] چاری سے سمجھوتہ مکمل ہو رہا تھا، اور حیدرآباد کی عدیدیت (Oligarchy) کے قلعہ پر بہادر خاں کا ترقی پسند پرچم لہرانے کو تھا!



(حاشیہ صفحہ ۶۰) سے نواب نے اس پیشکش کو اس شرط کے ساتھ قبول کیا تھا کہ وہ ایک جاگیردار کی حیثیت سے نہیں بلکہ مجلس اتحاد المسلمین کی کونسل کے ایک رکن کی حیثیت سے کابینہ میں شامل ہو گئے۔

[1] پنڈت راما چاری آگے چلکر لائق علی کابینہ میں شامل ہو گئے تھے۔ حیدرآباد کے ایک سمجھدار اور اعتدال پسند لیڈر ہیں۔

باب پنجم

مجلس شہر لاتور

قاسم رضوی سے ملاقات

۱۹۴۲ء میں ہائی کورٹ سے سندِ وکالت حاصل کرکے میں نے شہر حیدرآباد کے ایک وکیل جلیل احمد کے ساتھ کام شروع کیا۔ کام کیا تھا ہائی کورٹ کے ضابطہ کی تکمیل تھی۔ حیدرآباد کے اکثر سینئر وکلاء کا یہ طریقہ تھا کہ جونیرس کو کام کا موقع نہ دیا جائے بلکہ محض مقدمات کی تاریخ تبدیل کرانے میں اُنھیں مصروف رکھا جائے۔ اس لئے کچھ روز بعد میں عبداللہ المسدوسی[1] کے ساتھ ہوگیا۔ لیکن اُن کے دفتر میں اُس وقت کوئی خاص کام نہیں تھا۔ کیونکہ وہ اُسی زمانہ میں ضلع محبوب نگر سے حیدرآباد منتقل ہوئے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ اولاً ابتدائی کام پر مہارت حاصل کروں تاکہ ہائی کورٹ میں آئندہ کوئی دشواری محسوس نہ ہو۔۔۔ میں اسی فکر میں تھا کہ قاسم رضوی سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ فوجداری کے بڑے وکیل سمجھے جاتے تھے اور ہر طرف اُن کی شہرت تھی۔ میں نے اپنا نقطۂ نظر

---

[1] دیکھئے حاشیہ ص

اُن کے سامنے پیش کیا، اور اُنھوں نے اپنے ساتھ لاتور میں کام کرنے کی مجھے دعوت دی۔ مئی کا مہینہ تھا میں اُن کے دفترِ وکالت میں داخل ہوا۔ خندہ پیشانی سے اُنھوں نے میرا استقبال کیا، اور دیر تک ہنس ہنس کر گفتگو کرتے رہے ـــــ ایک مثل اُن کے سامنے تھی مجھ سے فرمایا کہ ایک قتل کے مقدمہ کی تیاری کر رہا ہوں۔ واقعات دلچسپ ہیں۔ پرچہ اطلاعی کے مضمون ہی سے ہمیں بہت فائدہ ہوسکتا ہے۔ اُنھوں نے پرچہ اطلاعی پڑھا، چالان اور پنچنامے اور ڈاکٹر کی رپورٹ پڑھتے رہے، میں سُنتا رہا اور سوچتا رہا کہ دیکھئے قاسم رضوی کل کس طرح مختلف نکات سے فائدہ اُٹھاتے ہیں!

دوسرے روز اجلاس عدالت شروع ہوا اور یہ مقدمہ پیش ہوا مقتش اور گواہانِ رویت حاضر تھے۔ مقتش کا بیان ابتدائی ختم ہوا اور قاسم رضوی نے حاکم عدالت سے کہا کہ واجد رضوی ان پر جرح کریں گے ـــــ میں خالی الذہن تھا، ہکّا بکّا سا ہو گیا۔ میں نے اس سے قبل کسی معمولی مقدمہ میں بھی کسی گواہ پر جرح نہیں کی تھی، اور نہ اُس روز میں سمجھتا تھا کہ یہ نوبت آئے گی۔ مگر اُنھوں نے مسکرا کر کہا: "تکلف مت کرو، تمہیں اس کی فکر ہی کیا، مقدمہ خراب ہوگا تو ہونے دو، میرا مؤکل ہی تو جیل جائے گا۔ تمہیں جرح کرنی ہے اور حملہ گواہوں پر ـــــ" اور وہ اجلاس کے باہر ہو گئے۔

اِس طرح کام کی ابتدا ہوئی۔ گلبرگہ سیشن اور ہائی کورٹ میں اُن

کے اکثر مقدمات تھے اور لاتور کے مقدمات جونیرس کے سپرد تھے۔ وہ مختلف نکات ہمیں سمجھاتے اور مسائل پر سیر آفریں بحث کرتے ــــ قدم قدم پر ہماری ہمت افزائی ہوتی، دل بڑھایا جاتا اور ہم علم و بصیرت کی شمع سے اکتساب ضیار کرتے! حیدرآباد کے عام سینئر وکلاء کی روایات کے خلاف اُنھوں نے میری مالی امداد کرنے کی بھی ممکنہ کوشش کی لیکن ــــ 'جس چیز کو آپ خود اپنے لئے پسند نہیں کرتے تھے، دوسروں کے لئے کیوں پسند کریں؟'

سازش ۱۹۴۲ء میں جون کا مہینہ تھا، انگریزوں کو پے در پے شکست ہو رہی تھی۔ جاپانی فوجیں آسام کی حدود میں داخل ہو رہی تھیں، اور ہندوستان میں انڈین نیشنل آرمی کے استقبال کی تیاریاں کی جارہی تھیں۔ قائد اعظم نے اعلان کر دیا تھا کہ مسلمان کانگریس کا ساتھ نہیں دیں گے۔ دکن کا مسلمان بھی قائد اعظم کے حکم کے تابع تھا، اور لاتور کے ایک جلسہ میں قاسم رضوی نے کانگریسیوں کو متنبہ کر دیا تھا کہ ہر اُس تحریک کی مخالفت کی جائے گی جو مسلمانوں کی محکومی کے لئے چلائی جائیگی۔ ــــ ادھر قاسم رضوی نے یہ تقریر کی اور اُدھر عدالت فوجداری میں بے شمار چالان ایسے غریب مسلمانوں کے خلاف پیش ہونے لگے جو اپنی پیروی کا انتظام تک نہیں کر سکتے تھے ــــ

کانگریسیوں نے دراصل پولیس کے ساتھ سازش کی تھی۔ اُنھوں نے عدیدیت کی اُس کمزوری سے استفادہ کیا تھا جسے رشوت ستانی کہا جاتا ہے۔ کروڑ پتیوں نے چندے جمع کئے تھے اور ضلع بھر کے عہدہ دارانِ کوتوالی کو خرید لیا تھا۔ آتش فشاں مادہ اندر ہی اندر یکجا جارہا تھا اور اُس کے پھٹنے کے لئے انتظامات کئے جارہے تھے۔ قاسم رضوی کی دوربین نگاہوں نے آنے والے طوفان کو دیکھ لیا اور غریب مسلمانوں کو جھوٹے مقدمات سے نجات دلانے کے لئے جدو جہد شروع کی۔

اگست میں واردھائی سیاست میں **ہندوستان چھوڑ دو** طوفان اُمڈ آیا، اور مغرورموجوں نے تباہیوں کو ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلا دیا۔ انگریزوں کی حالتِ زار سے فائدہ اٹھاکر "ہندوستان چھوڑ دو" (Quit India.) کا نعرہ بلند کیا گیا۔ اِدھر پیر واردھا اور اُس کے مریدوں کو سر آغا خاں کے قصرِ پونہ میں پہنچا دیا گیا اور اُدھر طبل جنگ پر چوب پڑی، اور ہندوستان کی سرزمین پر گویا بھونچال سا آگیا ——— حکومت کے خلاف مظاہرے شروع ہوئے۔ ریلوں کی پٹریاں اُکھاڑی گئیں، تار کاٹے گئے اور سرکاری دفاتر نذرِ آتش کردئے گئے ——— لاتور بھی ان تخریبی کارروائیوں کا مرکز بن گیا۔ لیکن کوئی گرفتاری عمل میں

لے دیکھئے صفحہ ۔

نہیں آئی، کسی کو سزا نہیں سنائی گئی ـــــ پولیس پر روپیہ کی مروّت غالب تھی!

ستمبر کے مہینے میں قدیم روایات کے مطابق یومِ خودمختاری منایا گیا، اور جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے قاسم رضوی نے کہا:

"میں اس غلط فہمی کو دُور کرنا چاہتا ہوں کہ مسلمان ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط چاہتے ہیں۔ میں ایسے شخص کو مسلمان باور کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہوں جو ملک کی غلامی کو گوارا کرتا ہو! میں مسلمان ہوں اور میرے دل میں آزادی کا جذبہ ہے اور ملک کو آزاد کرانے کی کشمکش میں میں کسی سے پیچھے نہیں رہوں گا"

"لیکن میں اس پاک جذبہ کو کسی ذلت آمیز طریقۂ کار سے گندہ نہیں کروں گا ـــــ میں دشمن کو مجبور پاکر حملہ نہیں کرونگا"

"مسٹر گاندھی نے جو کچھ کیا ہے وہ اُن کی روایات کے خلاف نہیں ہے، مقابل کی غفلت اور لاچاری سے فائدہ اُٹھا کر اُس کی پیٹھ میں خنجر گھونپ دینا بنیوں کی فطرت اور اُن کی تاریخ ہے۔"

"اس ساری غنڈہ گردی کے لئے میں ہندو سرمایہ داروں کو ذمہ دار قرار دیتا ہوں، جو بلاک مارکٹنگ کا روپیہ ہندو سرمایہ دار راج کے قیام کے لئے پانی کی طرح بہا رہے ہیں

ان کی غرض انگریزوں کو ہٹانے سے زیادہ مسلمانوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غلام اور محکوم کرنا ہے۔" ——— "ہندوستان چھوڑ دو" کا نعرہ لگایا جاتا ہے۔ لیکن مجھے کوئی بتائے کہ ہندوستان کس پر چھوڑ دو؟ بنیوں پر؟ برہمنوں پر؟ ——— لیکن مجھے آقاؤں کی تبدیلی منظور نہیں ہے۔ میں اپنے تمام وسائل کو استعمال کروں گا اور اُس کوشش کو ناکام کردوں گا جو میری غلامی کے لئے کی جائے۔"

ساہوکاروں کا احتجاج

قاسم رضوی کی اس تقریر سے ہندو سرمایہ دار بہت چراغ پا ہوئے۔ "مہاتما" کی شان میں "گستاخی" کو وہ کس طرح نظر انداز کر سکتے تھے۔

ضلع کا کلکٹر عابد علی خاں تھا جس کی مرعوب ذہنیت سے سرمایہ دار ہمیشہ فائدہ اٹھاتے رہے۔ چنانچہ قاسم رضوی کے خلاف احتجاجی درخواستیں پیش کی گئیں کہ اُنھوں نے 'ہندو قوم' کے جذبات کو "ٹھیس" پہنچائی ہے۔ قاسم رضوی کی طلبی کا حکم دیا گیا، اور سر رشتہ دار نے حسب ذیل طلب نامہ کلکٹر کے دستخط کے لئے پیش کیا:

" محمد قاسم رضوی صاحب وکیل

آپ بتاریخ ۲۹۔ ستمبر ۱۹۴۲ء محکمہ ہذا میں حاضر آئیے۔

تعلقدار

لیکن عابد علی خاں نے اپنے قلم سے اس میں ترمیم کی اور نام

سے قبل الفاظ "خدمت جناب" کا اضافہ کرکے الفاظ "حاضر آئیے" کو قلمزد کیا اور اُن کی جگہ یہ الفاظ لکھے:

"تشریف لائیں تو میں بہت ممنون ہوں گا"

قانوناً کلکٹر[1] کو اس طرح طلب کرنے کا اختیار نہیں تھا، لیکن اُس کے طریقۂ تحریر سے متاثر ہوکر قاسم رضوی نے اُس کو جواب دیا کہ وہ تاریخ مقررہ پر آرہے ہیں۔ لیکن ۲۸۔ اکتوبر کو گلبرگہ سشن میں مقدمات طول کھینچ گئے اور اسٹیشن پر بروقت نہ پہنچنے سے وہ ۲۹۔ اکتوبر کو عثمان آباد نہ جاسکے۔ اُنھوں نے ٹیلیگرام بھی دیا لیکن اتفاق سے پہنچ نہ سکا۔ اس پر عابد علی خاں کو بڑا تاؤ آیا اور اُس نے اُنھیں طلب کرنے کا مکرر حکم دیا۔ اُس کی سابقہ ترمیمات کو سررشتہ دار دیکھ چکا تھا، چنانچہ حسب ذیل طلبنامہ دستخط کے لئے اُس نے پیش کیا:

خدمت جناب محمد قاسم رضوی صاحب

آپ بتاریخ ۷۔ اکتوبر ۱۹۴۲ء محکمہ ہذا میں تشریف لائیں، تو باعث ممنونیت ہے۔ آپ کی عدم موجودگی کے باعث ۲۹۔ ستمبر کی تاریخ تبدیل کردی گئی ہے۔

تعلقدار

لیکن عابد علی خاں نے الفاظ "خدمت جناب" کو قلمزد کیا "تشریف لائیں

---

[1] چونکہ حیدرآباد کی عدلیہ (Judictary) اور عاملہ (Executive) میں تفریق کی گئی ہے اس لئے کلکٹر کو عدالتی اختیارات حاصل نہیں ہیں۔

تو باعثِ ممنونیت ہے"۔ کو کاٹ کر" حاضر آئیں" لکھا، اور آخر میں حسب ذیل الفاظ کا اضافہ کیا:

" اس تاریخ پر آپ حاضر نہ آئیں گے تو آپ کے خلاف کارروائی ضابطہ کی جائے گی"

یہ مکتوب کیا تھا قاسم رضوی کی خود داری کے لئے ایک تازیانہ تھا۔ انھوں نے اس کا جواب حسب ذیل دیا:۔

" میں آپ کے ہاں" حاضر آنے" کے لئے آمادہ نہیں ہوں۔ میں نے گذشتہ مرتبہ آپ کی شریفانہ طرز تحریر کے مدِ نظر آنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ آپ جتنی چاہیں میرے خلاف کارروائیاں کر لیجئے۔ مجھے افسوس ہے کہ ضلع کا کلکٹر ملک کے ضابطہ سے واقف نہیں ہے۔"

"کسی شخص یا فرقہ کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی گئی ہے تو اس کے لئے فوجداری عدالتیں کھلی ہوئی ہیں۔ مکرر اور واضح الفاظ میں آپ کو مطلع کرتا ہوں کہ جو الفاظ میں نے لاتور کے جلسۂ عام میں کہے ہیں اُن پر مجھے اصرار ہے، اور اگر آپ کو میری رائے سے اختلاف ہے تو ذرا کُھلّم کُھلّا مجھے بتا دیجئے۔"

ایک اور سازش

جب حکومت کے رعب و داب سے قاسم رضوی کو متاثر نہ کیا جاسکا، تو سرمایہ داروں نے اُن کے قتل کی سازش کی، اور ایک خفیہ نشست میں آریہ جی

رضا کاروں کے نیتا وشنو ناتھ شولا پوری نے اس مہم کو سر کرنے کا بیڑا اٹھایا ——!

اکتوبر کی ۳۰ تاریخ تھی، قاسم رضوی نماز فجر سے فارغ بھی نہ ہونے پائے تھے کہ محمد اسحاق[1] اور باستو نے آواز دی۔ قاسم رضوی باہر نکلے۔ یہ دونوں بے چین معلوم ہوتے تھے۔ اُنھوں نے حالتِ اضطرار میں کہا: "ملکارجن آپ سے ملنا چاہتا ہے۔" اُن کی آنکھوں سے تشویشناک مسرتیں جھلک رہی تھیں۔" ملکارجن! اور مجھ سے ملنا چاہتا ہے؟ کیوں؟ آخر کیا بات ہے؟" قاسم رضوی نے پوچھا۔

"نہیں صاحب، ہم نہیں بتائیں گے، آپ اُسی کی زبانی سُن لیجئے کہ وہ کیوں ملنا چاہتا ہے۔"

اجازت ملی اور ملکارجن کو حاضر کیا گیا —— ملکارجن نے جھک کر قدموں کو چوما اور کہنے لگا کہ اگر آپ مجھے معاف کر دیں اور مجھے اپنی پناہ میں لیں تو میں ایک اہم قصہ آپ کو سناتا ہوں —— اُس نے کہا: "کل رات وشنو ناتھ شولا پوری نے ہم بیس جوانوں کو رائفلوں اور تلواروں اور پستولوں سے مسلح کر کے آپ کے گھر بھیجا تھا۔ ہم نے مادھو[2] سے سازش کر لی تھی کہ رات کے ایک بجے اُس کمرہ کا دریچہ

---

[1] محمد اسحاق مجلس کا ایک سرگرم کارکن اور بہادر نوجوان تھا، اُس نے کئی مرتبہ سماجیوں کے ہنگاموں کو ناکام کر دیا تھا۔

[2] مادھو ذات کا مرہٹہ اور قاسم رضوی کے ہاں ایک عرصہ سے ملازم تھا۔

کھول دیا جائے جس میں کہ آپ سوتے ہیں، اور یہ بھی طے تھا کہ بیگم صاحبہ کے زیورات کا صندوقچہ وہ اُٹھا لے آئے ——— ناڈھو نے ٹھیک ایک بجے دریچہ کھول دیا۔ اٹھارہ آدمی راستوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے اور میں اور میرے ساتھی دتو نے دریچہ میں سے آپ پر فائر کرنا چاہا، لیکن رائفل کی لبلبی پر ہمارا قابو باقی نہ رہا۔ اور ہم نے محسوس کیا کہ گویا آپ اپنی رائفل میں کارتوس بھر رہے ہیں۔ ہمارے حواس جاتے رہے، اور گرتے پڑتے ہم اپنے اکھاڑے پہنچے۔ وشوناتھ ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ہماری ناکامی پر اُسے سخت تاؤ آیا، کہنے لگا سخت غلطی کی، مجھے خود جانا چاہیئے تھا۔ کل رات میں تمہارے ساتھ چلوں گا،" ——— لیکن رات بھر میں سو نہیں سکا۔ میں گھر گیا اور اپنی ماں کو سارا قصہ سنایا ——— میری ماں کو بہت غصہ آیا اور اُس نے کہا" نادان چھوکرے! قاسم رضوی کے گھر جانے سے پہلے مجھ سے پوچھ لیتا تو میں تجھے بتاتی کہ اُس پر بندوق اور تلوار کا اثر نہیں ہو سکتا تیرا ماموں[1] ہمیشہ کوشش کرتا رہا کہ اُس کو کوئی مضرت پہنچائے۔ لیکن

[1] ملکارجن کے ماموں کا نام گُرلبّپا تھا۔ اُس زمانہ میں جبکہ قاسم رضوی لاتور گئے تھے، کوئی فرقہ واری جھگڑا ریاست حیدرآباد میں نہیں تھا۔ لاتور میں دو جماعتیں آپس میں لڑتی رہتی تھیں۔ ایک جماعت کا نام "چودہ گھر والے" تھا اور دوسری کا "پانسو گھر والے"۔ اور پہلی جماعت کا سرغنہ وشوناتھ شولاپوری تھا اور دوسری کا گُرلبّپا۔ ان جماعتوں کو مذہب اور اعتقادات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ہر مذہب اور فرقہ کے لوگ ان میں شریک تھے۔ لیکن اکثریت لنگایتوں کی تھی۔ ان جماعتوں کے کئی فوجداری مقدمات عدالت ابتدائی سے لے کر ہائی کورٹ تک چلتے رہتے تھے۔ وشوناتھ شولاپوری ایک اچھے وکیل

اُس کی آرزو ہمیشہ اُس کے دل ہی میں دفن رہی ——— اور کل صبح رام لنگ کا پجاری کہتا تھا کہ قاسم رضوی کی پیشانی مہاراج ایربھدر کی طرح ہے اور اُس کی آنکھوں میں مہاراج شرن بسپیا کی آنکھوں کی سی تیزی ہے۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ مہاراج ایربھدر دشمن کو دیکھتے تو وہ مطیع ہو جاتا، اور مہاراج شرن بسپیا جس کی طرف دیکھتے اُس کا دل دھڑکنے لگتا ——— کیا عجب ہے کہ قاسم رضوی اُن کا تجسم (Incornation.) ہو ——— تجھے مانک پربھو کی قسم تو اسی وقت چلا جا اور اُس کے

(حاشیہ صفحۂ گزشتہ) کی تلاش میں تھا۔ چنانچہ لاتور آتے ہی اُس نے قاسم رضوی کو اپنا وکیل مقرر کر لیا، اور اُنھوں نے اس کو کئی سنگین مقدمات سے بری کرا دیا۔ وشوناتھ اُن کا بہت چہیتا مؤکل تھا، اور وہ بھی اُن کی پرستش کرتا رہتا تھا۔ ۱۹۳۴ء کا ذکر ہے کہ چلتی ہوئی ٹرین کو روک کر دشوناتھ نے گرنبسپا کو نیچے اُتار لیا، اور اُس کی ناک کاٹ ڈالی۔ پولیس نے سنگین جرائم کا پرچہ چاک کر کے دشوناتھ کو گرفتار کیا۔ قاسم رضوی نے بھی اپنا پورا زور لگایا اور اس کو ضمانت پر رہا کرا دیا۔ اُن کی غیر معمولی دلچسپی سے چالان کے خارج ہونے کا امکان پیدا ہو گیا۔ اور اس لئے گرنبسپا نے قاسم رضوی کو ایک گم نام خط لکھا کہ اگر دشوناتھ کی وکالت سے دست بردار نہیں ہونگے تو اُن کی ناک کاٹ لی جائے گی ——— اُس وقت لاتور میں مرض طاعون پھوٹ پڑا تھا اور آبادی کا تخلیہ ہو چکا تھا۔ لاتور سے تین میل کے فاصلہ پر گرنبسپا کی اراضی میں پانسو گھر والوں نے اپنے کیمپ قائم کئے تھے ——— قاسم رضوی اُسی رات ان کیمپوں کی طرف نکلے اور اُس جگہ پہونچ گئے جہاں پارٹی کے لیڈر مشورے کیا کرتے تھے۔ قاسم رضوی کو دیکھتے ہی وہ بوکھلا گئے، اُنھیں کچھ سُجھائی نہ دیا۔ گرنبسپا نے آگے بڑھکر ان کا استقبال کیا اور پوچھا کہ کس لئے زحمت کی گئی ہے ——— قاسم رضوی نے نہایت سنجیدگی سے کہا کہ کچھ روز سے ناک ذرا لمبی ہو گئی ہے اور کھجلا رہی ہے، اس لئے اس طرف نکل آیا۔ گرنبسپا کھسیانا سا ہو گیا اور صفائی کی کوشش کرتا رہا ——— اور قاسم رضوی مسکراتے ہوئے لوگوں نے چائے سے اُن کی تواضع کی اور رات میں ایک بجے اُنھیں گھر تک پہنچا دیا۔

پاؤں کو پکڑ کر معافی چاہ لے' ـــــ ملکارجن کانپ رہا تھا، اُس پر رقت طاری تھی، اُس نے کہا' صاحب، اگر آپ کو میری باتوں کا یقین نہ ہو تو دیکھیئے کہ مادھو آپ کے گھر میں موجود نہیں ہے ـــــ اور اُس نے کہا تھا کہ زیورات کا صندوقچہ اپنی جگہ سے ہٹے تو گیا لیکن اُٹھایا نہ جا سکا، آپ اس کی تصدیق کر لیجئے، اور وہ دیکھئے دریچہ کا پٹ ابھی تک کھُلا ہوا ہے، اور باہر ہمارے پاؤں کے نشان بھی ابھی تک موجود ہیں ـــــ ملکارجن کے ایک ایک لفظ سے واقعہ کی تصدیق ہو رہی تھی ـــــ!

چیتے کا جگر

اس سنگین واقعہ کی اِطلاع قاسم رضوی نے کسی کو نہیں دی اور نہ کوئی حفاظتی تدبیر اختیار کی ـــــ

سورج غروب ہوا، اور پھر آدھی رات گذر گئی۔ قاسم رضوی اپنے بستر سے اُٹھے، دبے پاؤں باہر نکلے، اور رات کے سناٹے میں وشو ناتھ شولا پوری کے اکھاڑے[1] میں داخل ہوئے ـــــ جہاں کئی جوان اُس رات کی مہم کو سر کرنے کے لئے تیار ہو رہے تھے، کوئی رائفل میں کارتوس بھر رہا تھا، کوئی تلوار صاف کر رہا تھا اور کوئی ہتھیار سنبھالے تیار کھڑا تھا ـــــ اور وشو ناتھ ان سب کو ضروری ہدایتیں دے رہا تھا۔ قاسم رضوی نے لپک کر وشو ناتھ کا ہاتھ پکڑ لیا، گویا کہ اُس پر بجلی گر گئی۔ وہ ساکت و مبہوت ہو گیا، ریوالور اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا، اور

---

[1] یہ اکھاڑہ آبادی کے باہر واقع تھا۔

اس کے پٹھے بدحواس ہوکر بھاگے اور عقبی کمروں میں چھپ گئے۔ قاسم رضوی نے وشوناتھ کا گلا پکڑ لیا اور شبیر کی طرح گرج کر کہا:

"بزدل، نامرد، میرے قتل کے لئے چھوکروں کو بھیجتا ہے لے، میں خود آگیا ہوں تاکہ تجھے آج میرے گھر آنے کی زحمت نہ ہو ــــ دیکھ! میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے (اُنھوں نے شیروانی کی جیبوں کو اُلٹتے ہوئے کہا) اور اپنے چھوکروں کو دُور دُور بھجوا کر دیکھ کہ میرے ساتھ کوئی آدمی بھی نہیں ہے ــــ مارنے کی آرزو ہو تو ہمت کر ــــ میں تیرے سامنے نہتا کھڑا ہوں۔"

قدرت کفر کی حرکت پہ خندہ زن تھی۔ قاسم رضوی کی زندگی کا چراغ پھونکوں سے نہیں بجھایا جاسکتا تھا۔ ــ وہ چراغ جو خون کے طوفانوں میں جلتا رہا، اور جس کو موت کی آندھیوں میں قدرت نے روشن رکھا! ــــ وشوناتھ کے جسم میں لرزہ پڑ گیا، اُس نے کچھ کہنا چاہا، مگر اُس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی ــــ بالآخر وہ اُن کے پاؤں پر گر گیا، پھوٹ پھوٹ کر رویا، گڑگڑا کر معافی چاہی اور ایک ایک کو اندر سے لاکر اُن کے قدموں پر ڈال دیا ــــ!

غنڈہ گردی کا انسداد

ہندوستان بھر میں ہنگاموں کا سلسلہ جاری تھا۔ دوسری ڈسمبر کو لاتور کے ڈاک خانہ کے تار کاٹ دیئے گئے اور لاتور سے ۴ میل کے فاصلہ پر

بارسی لائٹ ریلوے کی پٹریاں اکھاڑی گئیں، شہر میں سنسنی پھیل گئی، لیکن پولیس حسب دستور خاموش تھی۔ ہزاروں پُرامن شہریوں نے قاسم رضوی سے درخواست کی کہ امن کے تحفظ کے لئے اس معاملہ میں وہ دلچسپی لیں ــــــ

ملکارجن قاسم رضوی کے اعتماد میں آچکا تھا، اُس نے اُنھیں بتایا کہ کانگریسی غنڈہ گردی میں کن لوگوں کا ہاتھ ہے۔ اور کاٹے ہوئے تار اور پٹریاں کہاں رکھے جاتے ہیں۔ قاسم رضوی نے ہر بات کی تصدیق کر لی اور تفصیلی خط کے ذریعہ سکندرآباد ریلوے پولیس کو اطلاع دی جس کی ایک جماعت فوراً آگئی اور ملکارجن اور محمد اسحاق کے عملی تعاون سے ملزمین کو گرفتار کیا، مال برآمد کرایا اور عدالتِ فوجداری سے ملزمین کو سخت سزائیں دلائیں ــــــ حکومت نے ایک طویل مکتوب کے ذریعہ قاسم رضوی کی خدمات کو سراہا اور اُن کا شکریہ ادا کیا۔

پھر وہی سازش

عبرت ناک سزاؤں کے بعد غنڈہ گردی کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ لاتور کے ساہوکاروں کو بڑی فکر لاحق ہوئی، اور اُنھوں نے محسوس کیا کہ جب تک محمدؐ اسحاق زندہ ہے اُن کی تخریبی جد و جہد کا احیاء ناممکن ہے۔ چنانچہ اُس کے قتل کی پھر ایک سازش ہوئی۔ وشونا تھ کی پارٹی کی مکرر خدمات حاصل کی گئیں اور ایک روز جبکہ محمدؐ اسحاق سیکل پر قاسم رضوی کے گھر جارہا تھا۔

گھات سے نکل کر چودہ آدمیوں نے پستول اور تلواروں سے حملہ کیا۔ محمد اسحاق کی تلوار نیام سے نکلنے تک پستول کے دو فائر اور تلوار کے اُنیس وار اُس پر ہو چکے تھے۔ لیکن اِس مردِ مجاہد نے ہمت نہیں ہاری وہ اُن کا مقابلہ کرتا رہا اور اُن کے ہر وار کو اپنی تلوار پر لیتا رہا۔ یہاں تک کہ لوگ جمع ہوئے اور حملہ آور فرار ہو گئے، محمد اسحاق کو فوراً ہسپتال میں شریک کر دیا گیا

مسٹر لیلی[1] کا دورہ : جنگ کی مساعی کو تیز تر کرنے کے لئے حکومت نے ریاست کے گوشہ گوشہ میں وار کمیٹیاں قائم کی تھیں، اور اس سلسلہ میں چندوں کی فراہمی کی غرض سے مسٹر لیلی ملک کا دورہ کر رہے تھے ۱۱۔ نومبر کو کلکٹر ضلع عابد علی خاں کے ساتھ وہ لاتور آئے اور ۱۲۔ نومبر کو ایک جلسۂ عام میں لاتور کے ہندو سرمایہ دار ایک کیسۂ زر پیش کرنے والے تھے۔ اس جلسہ میں عوامی نمایندوں کی تقریریں بھی ضروری تھیں۔ اس لئے اشرف حسین تحصیلدار نے قاسم رضوی سے مشورہ کرنا چاہا۔ وہ تقریر کے لئے اس شرط پر راضی تھے کہ یوم خود مختاری کے جلسۂ عام کی تقریر، سرمایہ داروں کے احتجاج اور عابد علی خاں کے طرزِ عمل پر تبصرہ کرنے کی اُنھیں آزادی حاصل رہے۔ اشرف حسین کلکٹر کے ماتحت تھے

---

[1] مسٹر لیلی مجلس مال گزاری (Board of Revenue) کے معتمد تھے، اور پولیس کا محکمہ بھی اُن کے تحت تھا۔

اور قاسم رضوی کی ایسی تقریر سے افسر بالادست کی خفگی کا اُنھیں خطرہ تھا۔ اس لئے یہ طے ہوا کہ قاسم رضوی کے بجائے میں تقریر کروں گا اشرف حسین چلے گئے۔ قاسم رضوی نے میری طرف نگاہ تیز کو منعطف کیا اور کل کی تقریر کے لئے میرا دل و دماغ روشن ہو گیا ——!

حقیقت کا انکشاف

دوسرے روز جلسہ ہوا۔ ہال اور وراندہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، اور وسیع احاطہ میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ لاتور کے بڑے بڑے ساہوکار صفِ اول میں بیٹھے ہوئے تھے، اور عوام قاسم رضوی کی تقریر سننے کے لئے بے چین تھے۔ لیکن قاسم رضوی جلسہ گاہ میں موجود نہیں تھے۔ ساہوکاروں کے نمایندے وشنو داس کسار کھیڑے والے نے ابتداءً تقریر کی، اور جنگ "جیتنے کے لئے" اپنی جد و جہد کی وضاحت کی۔ کیسۂ زر پیش ہوا، اور پھر میرے نام کا اعلان ہوا۔ میں نے جنگ کی تاریخ پر مختصراً روشنی ڈالی، موجودہ جنگ عظیم میں اتحادیوں کے ساتھ مسلم ممالک، مسلمانانِ ہند اور ریاست حیدرآباد کے عملی تعاون کا ذکر کیا، اور غنڈہ گردی کی مذمت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ملک کے طول و عرض میں غنڈہ گردی "سرمایہ دارانہ تائید" کی وجہ سے زندہ ہے۔ سرمایہ دار دو رنگی اختیار کئے ہوئے ہیں، جب خلوت میں جاتے ہیں تو "کار دیگر" کرتے ہیں۔ انگریزوں کی مجبوری سے فائدہ اُٹھا کر مسٹر گاندھی نے اُن کی پیٹھ میں خنجر گھونپ دیا ہے اور عدم تشدد کے پرستار جو

سامنے بیٹھے ہیں، اپنے سرمایہ سے خونریزی اور غارت گری کی آبیاری
کر رہے ہیں۔ میں نے مسٹر لیلی سے پوچھا کہ کیا یہ حقیقت نہیں
ہے اور کیا آپ ان انسانیت سوز افعال کی مذمت نہیں کرتے ہیں،
اور پھر عابد علی خاں کی طرف پلٹ کر میں نے کہا کہ صاحب ضلع پر میں
یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ سچ کہنا کوئی جرم نہیں ہے، کیا مسٹر لیلی
کو آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ موجودہ واردھائی سیاست سے آپ کو
اختلاف نہیں ہے!—— مجمع میں قاسم رضوی زندہ باد کے نعرے
بار بار بلند ہو رہے تھے، آسمان پھٹا پڑتا تھا—— سارا معاملہ چوپٹ
ہو چکا تھا، بازی اُلٹ گئی تھی۔ مسٹر لیلی مسرور تھے۔ لیکن عابد علیخاں
کے چہرہ پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا—— جلسہ ختم ہوا
باطل کی شکست پر!—— سچ کی فتح پر! قاسم رضوی کے نقطۂ نظر
کی فتح پر!!!

ایک اور سازش

جلسہ کی "ناکامی" سے ساہوکاروں اور عہدہ داروں کو بڑی کوفت ہوئی، مسائل پر غور ہوا، اور
'رکاوٹوں' کو رفع کرنے کے لئے پالیسی متعین کی گئی——

اُس زمانہ میں غلہ کی بڑی کمی واقع ہو گئی تھی۔ اجناس کی منتقلی
پر حکومت کی نگرانی تھی، اور عہدہ دارانِ متعلقہ اپنے اختیارات کو بد دیانتی
سے استعمال کر رہے تھے۔ رشوت ستانی کے قصّے عام ہو گئے تھے،
اور عوام میں ہیجان بپا تھا۔

ایک رات چالیس بنڈیوں کو جو غلّہ لے جا رہی تھیں، شہر کے باہر کچھ لوگوں نے روک لیا۔ اس کی اطلاع آگ کی طرح پھیل گئی۔ ہزاروں آدمی جمع ہوگئے، اور ان بنڈیوں کو لاتور کے سب سے بڑے بازار اعظم گنج میں لایا گیا۔ تحصیلدار اور ڈپٹی کلکٹر موقع پر پہونچ گئے، اور عوام نے اُن سے مطالبہ کیا کہ اِس غلّہ کو سرکاری دوکانوں میں رکھدیا جائے، کیونکہ لوگ بھوک سے مر رہے ہیں۔ صورتِ حال پر خوش اسلوبی سے قابو پایا جا سکتا تھا۔ لیکن تحصیلدار اپنی ضد پر اڑا رہا۔ اور بالآخر تنگ آکر عوام نے رات کے ایک بجے سارا غلّہ لوٹ لیا ـــــ قاسم رضوی اُس روز لاتور میں نہیں تھے۔ اس واقعہ کی اطلاع ضلع اور مرکز کو دی گئی۔ عابد علی خاں موقع پر پہنچ گئے ساہوکاروں سے مشورہ کیا، اور طے ہوا کہ حالات سے مکمل استفادہ کیا جائے۔ اور نہ صرف قاسم رضوی کو بلکہ اُن کی ساری جماعت کو پھانس لیا جائے۔ چنانچہ ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت پرچۂ اطلاعی چاک کیا گیا، عام گرفتاریاں شروع ہوئیں، اور مجلس کے متعدد کارکن بھی گرفتار کئے گئے۔ قاسم رضوی دوسرے روز لاتور پہنچ گئے۔

محمد اسحاق کو ہسپتال میں ابھی صحت نہیں ہوئی تھی، وہ چل پھر بھی نہیں سکتا تھا۔ لیکن اُس روز اُس کے بچّے کی رسم تسمیہ خوانی مقرر تھی۔ ڈاکٹر جوشی کی اجازت سے اپنے بچوں کے ساتھ ایک بنڈی میں بیٹھکر کپڑا خریدنے کے لئے وہ بازار گیا۔ دیوی داس بھاٹیا کی دوکان سے

کپڑا خریدا اور لوٹ رہا تھا کہ پولیس کے ایک جمعدار نے مددگار مہتمم کا پیام اُس کو پہونچایا کہ گرفتار شدگان کو ضمانت پر رہا کیا جارہا ہے اور اُس کی شخصی ضمانت پر مجلس کے کارکنوں کو رہا کیا جاسکتا ہے۔ محمد اسحاق اس بنڈی میں تھانہ پہنچا، جہاں مہتمم پولیس، تحصیلدار، کلکٹر اور ڈپٹی کلکٹر بھی موجود تھے۔ مددگار مہتمم نے مجلس کے کارکنوں کو رہا کر دیا، اور جب وہ احاطہ سے باہر نکل گئے تو اُن پر سخت فائرنگ کی گئی، جس میں محمد اسحاق، اُس کا پانچ سالہ لڑکا، اور دیگر پانچ اشخاص شہید اور متعدد زخمی ہوئے۔ قاسم رضوی اُس وقت لاتور میں موجود نہیں تھے۔ بلکہ واقعہ سے دو گھنٹے قبل اپنے ایک مقدمہ کے سلسلہ میں گلبرگہ روانہ ہو گئے تھے۔ اُنھیں ٹیلیگرام دیا گیا، اور وہ راستہ ہی سے ذریعہ موٹر بس لوٹ آگئے۔

شہر میں کرفیو نافذ تھا، ہر طرف دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ قاسم رضوی بس

لہ دیویداس بھاٹیا ایک ایماندار ہندو تھا۔ لیلی کمیشن (صفحہ ۸۴) نے اس کا بیان قلمبند کیا پولیس نے اس کو بہت مجبور کیا ڈرایا دھمکایا کہ کمیشن میں وہ بیان کرے کہ محمد اسحاق اُس روز بازار لوٹنے آیا تھا اور اُس کی دوکان سے کپڑا جبراً اُٹھا لے گیا۔ وغیرہ۔ لیکن دیویداس نے نہایت صداقت کے ساتھ حقیقی واقعات بیان کئے۔ حیدرآباد کی شکست کے بعد جب ہندو غنڈوں نے لاتور میں قتل عام شروع کیا، تو دیویداس نے بہت سے مظلوموں کو پناہ دی اور جب چند مسلمانوں کو سر بازار قتل کرنے کیلئے لایا گیا تو دیویداس نے درمیان میں حائل ہونیکی کوشش کی۔ جس پر دیویداس کو بھی گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا ــــ انسانیت کے لئے دیویداس نے جان دی ــــ انسانیت کا محسن دیویداس !!

سے اُتر کر پولیس تھانہ کی طرف چلے۔ میں بھی اُن کے ساتھ ہو گیا۔ اُن کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ بھنویں تنی ہوئی تھیں۔ آنکھوں سے شرارے ٹپک رہے تھے۔ تھانہ کے احاطہ میں ہم داخل ہوئے تو جائے کا دور چل رہا تھا۔ قاسم رضوی کے استفسار پر عابد علی خاں نے کہا کہ ڈپٹی کلکٹر عبداللہ کے حکم سے فائرنگ ہوئی ہے۔ ہم تھانہ سے باہر نکل رہے تھے کہ پھاٹک کے قریب عبداللہ ملے۔ قاسم رضوی نے اُن سے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ "واللہ میں نے کوئی حکم نہیں دیا۔" ہم گھر لوٹ آئے۔ مرکزی مجلس کو ٹیلیگرام دینے کی کوشش کی۔ لیکن کلکٹر کے حکم پر سارے ٹیلیگرام روک لئے گئے تھانہ میں ساہوکاروں اور عہدہ داروں کی نشست ہوئی اور قاسم رضوی کی گرفتاری کے لئے رات بھر غور و خوض ہوتا رہا۔

ادھر قاسم رضوی بھی رات بھر جاگتے رہے۔ انھوں نے معاملہ کے ہر پہلو پر غور کیا، اور ایک ہدایت نامہ مرتب کیا کہ اُن کی گرفتاری کی صورت میں واجد رضوی صدارت کے فرائض انجام دیں گے۔ کوئی مسلمان پولیس سے تعاون نہیں کرے گا بلکہ آزادانہ تحقیقات کے لئے کمیشن کے قیام کا مجلس کی جانب سے سخت مطالبہ کیا جائے گا۔

بہر حال قاسم رضوی کی گرفتاری کی جرأت نہ ہو سکی۔ اس لئے دوسرے روز عابد علی خاں نے انھیں ایک خط لکھا کہ "جو کچھ ہوا اُس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ مجھے امید ہے کہ قیام امن کے لئے آپ حکومت سے تعاون کریں گے۔ قاسم رضوی نے اس کا صرف اتنا

جواب دیا کہ :

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا!

کردار کی بلندی

قاسم رضوی کا یہ جواب عابد علی خاں کی طبع نازک پر گراں گزرا۔ منسٹروں سے تبادلۂ خیال ہوا۔ اور گرفتاریوں کی رفتار کو تیز تر کر دیا گیا۔ تیسرے روز شام تک مجلس کی عاملہ اور شوریٰ کے تقریباً تمام اراکین اور دیگر کارکنوں کو حراست میں لے لیا گیا، اور عدالت کو اس مضمون کا پرچۂ اطلاعی روانہ کیا گیا، کہ محمد اسحاق کی مسلح پارٹی نے ڈکیتی (غلّہ کی لوٹ) کے ملزمین کو حراستِ جائزہ سے فرار کرا کے تھانہ پر فائرنگ کی، اور پولیس نے بھی مجبوراً حفاظتِ خود اختیاری کے لئے حملہ آوروں پر جوابی فائرنگ کی۔ جس کے نتیجہ میں سات اشخاص ہلاک ہو گئے۔ ملزمین کی گرفتاری کا سلسلہ جاری ہے، وغیرہ

قاسم رضوی تنہا جیل کے باہر تھے۔ اُن کے لوگ یا تو قتل اور زخمی ہو گئے تھے یا گرفتار کئے جا چکے تھے۔ نیز مرکزی مجلس کو ابھی تک اطلاع نہ ہو سکی تھی۔ دوسری طرف ہندو سرمایہ دار اُن کی گرفتاری پر مصر تھے اور ہر لمحہ اُن کو حراست میں لئے جانے کا امکان تھا۔ معمولی کانسٹبل سے اعلیٰ ترین عہدہ دار کو توالی تک فائرنگ کے جواز کے لئے امکانی کوشش کر رہے تھے، اور حکومت کی ساری مشینری قاسم رضوی

کے خلاف حرکت میں آچکی تھی۔ اُن کے لئے بہت آسان تھا کہ دستِ تعاون دراز کر کے تمام خطرات اور پریشانیوں سے نجات حاصل کرتے۔ عہدہ دار اس کے آرزومند تھے کیونکہ انھیں اس بات کا یقین ہو چلا تھا کہ کھلی تحقیقات میں جھوٹ کا پول کھل جائے گا۔ اور حقیقت آشکار ہو کے رہے گی۔ انھوں نے اس سلسلہ میں قاسم رضوی کو متعدد پیامات بھیجے، اور طرح طرح سے مرعوب کرنے کی سعی کی —— لیکن حق کا یہ علمبردار باطل کی قوتوں سے دبنے والا نہیں تھا۔ وہ زمانہ سازی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُس کے نزدیک زمانہ سازی، ضمیر فروشی کے مترادف تھی ——!

ایک ہفتہ گزر گیا۔ قاسم رضوی نے مرکزی مجلس اور مرکزی حکومت کو تمام واقعات سے مطلع کیا، اور ایک تحقیقاتی کمیشن کے قیام کا شدت سے مطالبہ کیا۔ رائے عامہ تائید میں تھی۔ پریس نے شور و پکار کیا اور مرکزی مجلس بھی اڑ گئی۔ چنانچہ حکومت نے ایک تحقیقاتی کمیشن کے قیام کا اعلان کر دیا۔

لیلی کمیشن یہ کمیشن تین اشخاص پر مشتمل تھا۔ مسٹر لیلی اُس کے صدر اور مسٹر آرمدو ا اینگار[1] ایڈوکیٹ اور مسٹر عبد الحمید ہائیکورٹ جج اس کے ارکان تھے۔ مسٹر لیلی کو فوجداری مقدمات کا کبھی کوئی تجربہ نہیں تھا، اور مسٹر اینگار محض دیوانی کے وکیل تھے نیز لاتور کے تقریبًا

---

[1] دستوری اصلاحات کے کمیشن کے صدر۔

تمام بڑے ساہوکار اُن کے مؤکل تھے۔ لطف یہ تھا کہ کمیشن کی تحقیقات میں گواہان پر جرح کا حق نہیں تھا۔ البتہ اگر کوئی سوال ضروری ہو تو درخواست پیش ہونے پر ارکانِ کمیشن اجازت دینے کے مجاز تھے ـــــــ لیکن مرکزی مجلس کے اصرار پر حکومت نے ارکانِ کمیشن کو ہدایت کردی کہ عام طور پر ایسا کوئی سوال نامنظور کیا جاوے۔

تحقیقات لاتور کے ٹاؤن ہال میں تحقیقات شروع ہوئی۔ سب سے پہلے مہتمم کوتوالی علی اکبر پیش ہوئے۔ علی اکبر نے قاسم رضوی کے سوال پر بتایا کہ محمد اسحاق اور اُس کے ساتھی تھانہ پر فائر کر رہے تھے۔ تھانہ اور احاطہ کی دیواروں پر گولیوں اور چھرّوں کے نشانات موجود ہیں۔ گولیاں دیواروں میں آدھا آدھا انچ دھنس گئی ہیں، اور چھرّوں سے پلاسٹر کا چونہ اُکھڑ گیا ہے۔ لیکن پولیس کا کوئی آدمی زخمی نہیں ہوا، اور نہ گولی یا سیسہ کا کوئی ٹکڑا دستیاب ہوسکا۔ قاسم رضوی نے کمیشن سے درخواست کی کہ اس فائرنگ کا تجربہ کیا جائے۔ کیونکہ جو نشانات تھانہ کی دیواروں پر موجود ہیں وہ گولی یا چھرّوں کے نہیں ہیں[1]۔ مسٹر انیگار نے گریز کرنا چاہا۔ لیکن مسٹر عبدالحمید اور مسٹر لیلی راضی ہوگئے۔ چنانچہ علی اکبر کے مبینہ فاصلہ اور پولیس کی برآمد کردہ بندوقیں سے تھانہ اور احاطہ کی دیواروں پر گولیوں اور چھرّوں کے فائر کئے گئے۔ گولیاں چار، چھ

---

[1] پولیس نے واقعہ کے بعد سنگینوں سے دیواروں پر نشانات بنالئے تھے۔

انچ اور چھرّے ایک، ڈیڑھ انچ دیواروں میں دھنس گئے، اور تقریباً تمام گولیاں اور چھرّے دستیاب ہو گئے —— پولیس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ عابد علی خاں کی صورت فق ہو گئی۔ استغاثہ کا پول کھُل گیا اور حقیقت دنیا کے سامنے آ گئی۔!

علی اکبر کے بعد دیگر عہدہ داروں کے بیانات شروع ہوئے لیکن اس نوبت پر یہ طے کیا گیا کہ اس معاملہ میں قاسم رضوی کو بھی اُلجھایا جائے اور ثابت کیا جائے کہ یہ واقعہ اُن ہی کے اشارہ سے ہوا ہے اور اکثر قانون کی خلاف ورزیاں اُن ہی کی اعانت سے ہوئی ہیں چنانچہ اُن مقدمات کا تفصیلی ریکارڈ پیش کیا گیا۔ جن کے چالانات کا سلسلہ ماہ جون[۵۱] ۱۹۴۲ء سے شروع ہوا تھا —— مسٹر اینگار اپنے ایک مؤکل اور کانگریسی لیڈر سیٹھ دیا رام سورج مل کے ہاں مقیم تھے کمیشن کے اجلاس پر پیش ہونے والے گواہوں کو وہ قبل از قبل جانچ لیتے اور ضروری ہدایات دیتے —— لیکن قاسم رضوی کی سنگین جرح کے آگے کسی گواہ کی بن نہ پڑی۔ ہر روز بہتر سے بہتر گواہوں کو پیش کرنے کی سعی کی گئی۔ لیکن ہر روز استغاثہ کو شکست پہ شکست ہوتی چلی گئی ——!

تحقیقات کا آخری دن تھا۔ ڈاکٹر کلکرنی کو کمیشن کے سامنے پیش کیا گیا جو مسٹر اینگار کا دوست اور لاتور کا مشہور ڈاکٹر سمجھا جاتا

---

۵۱ دیکھئے صفحہ ۶۶

تھا۔ اُس نے بیان کیا کہ فائرنگ اور غلّہ کی لوٹ کی وارداتیں قاسم رضوی کے اشارہ سے ہوئی ہیں۔ لاتور کی فرقہ وارانہ فضا کو انہی نے مسموم کیا ہے، اور ساری خرابیوں کی ذمہ داری انہی پر ہے۔ اس لئے انھیں سزا دلائی جائے اور لاتور بدر کر دیا جائے، وغیرہ۔

قاسم رضوی نے ان پر جرح شروع کی:

قاسم رضوی (مسکراکر) آپ کو یقین ہے کہ ساری خرابیوں کا میں ہی ذمہ دار ہوں

ڈاکٹر کلکرنی: جی ہاں کامل یقین ہے۔

قاسم رضوی: آپ کی رائے میں یہ خرابیاں کب سے پیدا ہوئیں؟

ڈاکٹر کلکرنی: (خود اعتمادی کے ساتھ) جب سے کہ آپ لاتور آئے ہیں۔

قاسم رضوی: کبھی آپ نے اس بارے میں پولیس یا عدالت سے شکایت کی ہے؟

ڈاکٹر کلکرنی: نہیں!

قاسم رضوی: ذرا حافظہ پر زور ڈال کر مجھے بتائیے کہ کیا کبھی آپ نے لاتور کی ساری خرابیوں کی ذمہ داری کسی اور پر عائد کی ہے؟

ڈاکٹر کلکرنی: کبھی نہیں!

قاسم رضوی: دیکھئے کبھی آپ کا لڑکا گرفتار ہوا تھا؟

ڈاکٹر کلکرنی: (سہم کر) ہاں گرفتار ہوا تھا، پولیس نے بلا وجہ آریہ سماج ستیاگرہ کے سلسلہ میں گرفتار کیا تھا —— مگر وہ تو چھوٹ گیا۔

قاسم رضوی: کس طرح چھوٹا؟ بری کر دیا گیا!

ڈاکٹر کلکرنی: نہیں میری درخواست پر عدالت نے چھوڑا۔

قاسم رضوی: اس درخواست میں کیا لکھا تھا؟

ڈاکٹر کلکرنی: میں نے لکھا تھا کہ میرا لڑکا کم سِن ہے

قاسم رضوی: اور کیا لکھا تھا؟

ڈاکٹر کلکرنی: اور کچھ نہیں۔

قاسم رضوی:۔ دیکھیئے میں یاد دلا کر آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ نے درخواست میں یہ لکھا تھا کہ میرا لڑکا کم سِن ہے۔ آریہ سماجی غنڈوں نے اُسے بہکایا ہے، اور آپ نے یہ بھی لکھا تھا کہ لاتور کے فسادات اور ساری خرابیوں کی ذمہ داری کانگریسی اور آریہ سماجی لیڈروں پر ہے۔

ڈاکٹر کلکرنی: آپ میرے وکیل تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ نے کیا لکھا ہے۔

قاسم رضوی: درخواست کس کی قلمی ہے؟

ڈاکٹر کلکرنی: آپ کی۔

قاسم رضوی: اور میرے دستخط بھی اُس پر ہیں؟

ڈاکٹر کلکرنی: آپ ہی کے ہیں۔

قاسم رضوی: اور میرا وکالت نامہ بھی اُس کے ساتھ ہے؟

ڈاکٹر کلکرنی: جی ہاں ہے!

قاسم رضوی: اور پھر عدالت میں درخواست کس نے پیش کی؟

ڈاکٹر کلکرنی: آپ نے!

قاسم رضوی : اور پھر عدالت نے کیا کہا ؟
ڈاکٹر کلکرنی : مجھے نہیں معلوم کہ آپ سے کیا کہا ، مَیں تو باہر تھا ۔
(قاسم رضوی کی درخواست پر مقدمہ کی مثل عدالت سے طلب کی گئی)
قاسم رضوی : دیکھئے ڈاکٹر صاحب ، اس مثل میں سے اپنی درخواست نکالیے
اور مجھے بتائیے کہ اس کا کاتب کون ہے ؟
ڈاکٹر کلکرنی : (پریشان ہوکر) اس پر تو محسن الدین لکھا ہوا ہے ۔
قاسم رضوی : معزز کمیشن کو اس درخواست پر میرے دستخط بتائیے ۔
ڈاکٹر کلکرنی : (بڑی تاخیر سے) آپ کے دستخط مجھے اس پر نظر نہیں آتے ۔
قاسم رضوی : اور آپ کے دستخط تو اس پر نہیں ہیں ؟
ڈاکٹر کلکرنی : جی — اس پر تو — میرے دستخط ...... ہیں ۔
قاسم رضوی : اور عدالت نے اس پر یہ لکھا ہے کہ ڈاکٹر کلکرنی اجلاس
پر موجود نہیں ہیں !
ڈاکٹر کلکرنی (پسینہ پونچھتے ہوئے) : نہیں عدالت نے ایسا نہیں لکھا ہے ۔
قاسم رضوی : معزز ارکان کو بتائیے کہ عدالت نے پھر کیا لکھا ہے ؟
ڈاکٹر کلکرنی : (زبان لڑکھڑا رہی تھی) ڈاکٹر کلکرنی کو درخواست کا مضمون پڑھکر
سنایا گیا - وہ اس کی صحت تسلیم کرتے ہیں ۔
قاسم رضوی : اچھا میرا وکالت نامہ تو مثل سے نکالیے ۔
ڈاکٹر کلکرنی : (مثل کا ایک ایک ورق الٹ کر) اس میں نہیں ہے ۔
قاسم رضوی : فہرست مثل پڑھکر دیکھیے کہ کہیں وکالت نامہ کا اندراج ہے ؟

ڈاکٹر کلکرنی: نہیں ہے۔

قاسم رضوی: درخواست کو پڑھکر دیکھیے کہ آپ نے اس میں یہ لکھا ہے
کہ لاتور کی ساری خرابیوں کی ذمہ داری قاسم رضوی پر ہے۔

ڈاکٹر کلکرنی: (درخواست کو غور سے دیکھتے ہوئے) نہیں ایسا نہیں ہے۔

قاسم رضوی: معزز ارکان کو صاف صاف بتلایئے کہ آپ نے اس
درخواست میں خرابیوں کی ذمہ داری کس پر عائد کی ہے؟

(ڈاکٹر کلکرنی پسینہ میں شرابور تھے۔ اُن کے ہاتھ پاؤں میں
لرزہ پڑگیا تھا، وہ خاموش تھے۔ ـــــ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا
تھا لیکن مجمع پر سکتہ طاری تھا۔)

قاسم رضوی: (گرجدار آواز میں) آپ نہیں بتانا چاہتے تو دیکھئے، میں
درخواست کا مضمون آپ کو پڑھکر سناتا ہوں۔ آپ معزز
ارکان کو بتایئے کہ یہ مضمون سچ ہے یا جھوٹ؟

(قاسم رضوی نے بلند آواز سے درخواست کا مضمون پڑھنا
شروع کیا۔)

"جناب عالی! میرے لڑکے کو پولیس نے ریمانڈ جیل کیا ہے،
دراصل مجھے ستیہ گرہ یا کسی تخریبی کارروائی سے کبھی کوئی تعلق نہیں
رہا۔ میرا لڑکا کم سن ہے جسے آریہ سماجی اور کانگریسی غنڈوں نے
بہکایا ہے۔ میں ان غنڈوں کے اس عمل کی مذمت کرتا ہوں اور
یقین کرتا ہوں کہ لاتور اور ضلع بھر کی جملہ خرابیوں اور تباہیوں

کی ذمہ داری آریہ سماجی اور کانگریسی لیڈروں پر ہے جو فرقہ وارانہ فضا کو مسموم اور امن عامہ کو تباہ کر رہے ہیں۔ لاتور کے ہندو مسلمانوں کے تعلقات ان زہریلی تحریکات سے قبل بہت خوشگوار تھے اور آج بھی خوشگوار ہو سکتے ہیں بشرطیکہ غنڈوں کو عبرت ناک سزا دی جائے۔ اور ان لیڈروں کو شہر بدر کر دیا جائے جو شرفاء کے لڑکوں کو بہکا کر اُن کے خاندانوں کو مصیبت میں مبتلا کر رہے ہیں ــــ!"

کہیے مسٹر کلکرنی یہ صحیح ہے؟

ڈاکٹر کلکرنی نے سر ہلا کر گردن جھکالی ــــ اور کمیشن کی تحقیقات ختم ہو گئی۔! معاملہ چوپٹ ہو چکا تھا۔ بازی اُلٹ چکی تھی، مسٹر اینگار کی ہر کوشش ناکام ہو چکی تھی۔ وہ نیچے اُترے اور قاسم رضوی کے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہنے لگے:

"مسٹر قاسم رضوی! دیکھئے میرے سر کا ہر بال سفید ہے، لیکن میں نے آج تک آپ سے بہتر فوجداری کا کوئی وکیل نہیں دیکھا!!"

قاسم رضوی کے خلاف استغاثہ

کمیشن کی روئداد اگرچہ صراحتاً ہماری تائید میں تھی۔ لیکن مسٹر اینگار سے خطرہ لگا ہوا تھا اور اندیشہ تھا کہ مسٹر تیلی بھی عدیدیت کی ذہنیت کے مطابق اپنے ماتحت محکمۂ پولیس کی پچ کریں گے۔ اور

اِن دونوں کے متفق ہونے کی صورت میں قاسم رضوی کی ذات کو بھی بڑی مضرتوں کا امکان تھا۔ کیونکہ کمیشن کے تصفیہ کا کوئی مرافعہ ہو سکتا تھا، اور نہ اُس کے خلاف کوئی اور چارۂ کار اختیار کیا جاسکتا تھا۔ اِس کے برعکس کھلی عدالت میں معاملہ پیش ہوتا تو مرافعہ اور نگرانی کے متعدد چارۂ کار حاصل ہو سکتے، اور انصاف کے خون ہونے کا احتمال باقی نہیں رہتا۔۔۔۔ اس لئے یہ طے کیا گیا کہ میں عدالت فوجداری لاتور میں قاسم رضوی کے خلاف ایک استغاثہ پیش کروں۔ چنانچہ ایک استغاثہ اس مضمون کا لکھا گیا کہ میں لیلی کمیشن میں عوام کی جانب سے پیروی کر رہا تھا۔ پولیس کے پیش کردہ گواہوں نے یہ بتایا ہے کہ غلہ کی لوٹ اور پولیس تھانہ پر فائرنگ کے جرائم کا ارتکاب قاسم رضوی کی اعانت سے ہوا ہے۔ پولیس نے پرچۂ اطلاعی چاک کیا ہے لیکن فہرست ملزمین میں مبیّنہ ملزم قاسم رضوی کا نام شریک نہیں ہے۔ میں ایک شہری کی حیثیت سے لیلی کمیشن میں پیش شدہ گواہوں کے بیان کی اطلاع عدالت کو دیتا ہوں، اور درخواست کرتا ہوں کہ میرے استغاثہ کو پولیس کے چالان میں ضم کر کے قاسم رضوی کے خلاف بھی تحقیقات کرائی جائے۔

ناظمِ عدالت ایک ہندو تھا، اُس نے ہندو نہ عمارسے مشورہ کیا۔

---

[1] حیدرآباد میں عدلیہ آزاد اور خود مختار تھا۔ عاملہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا جس کی وجہ سے عام طور پر انصاف کا معیار بہت بلند تھا۔

وہ ہمارے مقصد کو سمجھ گئے۔ چنانچہ استغاثہ کو نمبر پہ لینے سے انکار کر کے محض پولیس کو اطلاع دینے پر اکتفا کیا گیا ـــــ لیکن اس کے بہت دُور رس اثرات مترتب ہوئے، اور مسٹر ایزگار کو قاسم رضوی کے خلاف قلم اُٹھانے سے قبل نتائج اور عواقب پر غور کرنے کے لئے مجبور ہونا پڑا۔

باطل کی شکست کیلی کمیشن کا نیصلہ سنایا نہیں گیا لیکن ملزمین کے خلاف عدالت فوجداری میں چالانات پیش ہو گئے۔ اس پر مجلس نے سخت احتجاج کیا اور عوام نے کمیشن کے نیصلہ کی اشاعت کا مطالبہ کیا۔ نیصلہ راز میں تھا۔ مسٹر عبدالحمید نے ایک غیر جانبدار جج کی طرح تبصرہ کرتے ہوئے پولیس کی سخت مذمت کی اور مسلمانوں کے قتل کی ذمہ داری عہدہ داروں پر عائد کی مسٹر ایزگار نے اس کے برعکس محمد اسحاق اور اُس کی پارٹی کو حملہ آور قرار دے کر پولیس کو حق حفاظت خود اختیاری کا فائدہ دیا۔ لیکن مسٹر کیلی کا نیصلہ بین بین تھا۔ مسٹر عبدالحمید کے مدلّل نیصلہ کی موجودگی میں حکومت کمیشن کی رپورٹ کی اشاعت کی جرأت نہ کر سکی۔ اُس کے سامنے پولیس کے وقار کا جھوٹا تصوّر موجود تھا۔ جس کے متاثر ہونے کا "اندیشہ" لاحق تھا ـــــ لیکن مجلس اور عوام کا مطالبہ شدت اختیار کر گیا، اور حکومت نے مجبوراً جملہ مقدمات اُٹھا لئے اور سارے ملزمین کو رہا کر دیا ـــــ جھوٹ کا قلعہ صداقت

کی آتشبازی کی تاب نہ لا سکا!

مقدمات کے اخراج اور ملزمین کی رہائی سے شرپسندوں کے دانت کھٹے ہو گئے۔ اُن کی تدبیریں خاک میں مل گئیں، اُن کے حوصلے پست ہو گئے۔ ضلع بھر کی سیاسی فضا، سے گرد وغبار صاف ہو گیا اور رفتہ رفتہ تمام ساہوکاروں نے اپنی خطا کا اعتراف کر لیا ——— قاسم رضوی کو ہائیکورٹ سے ایڈوکیٹ کا اعزاز عطا ہوا، اور لاتور کے عوام نے اس مسرت میں سیٹھ دیارام سورج مل کے سینما ہال میں ایک جلسۂ عام منعقد کیا۔ ساہوکاروں نے قاسم رضوی کو طلائی بٹن نذر کئے اور اُن کی خدمت میں ایک سپاس نامہ پیش کیا۔ جس میں اُن کے احسانات کا اعتراف کیا گیا اور اُن کی خدمات کو سراہا گیا ——— حقیقت کے روشن چہرہ سے تعصب کا پردہ اُٹھ گیا اور قاسم رضوی اب مسلمانوں ہی کا رہنما نہیں رہا بلکہ ہندوؤں کی بھی تمناؤں کا مرکز بن گیا ——— ہندو مسلم بھائی چارہ کا پیغمبر!!

ے اس نوبت پر میں نے عمر گہ پر اپنی علاوہ پریکٹس شروع کر دی تھی۔

باب ششم

مرکزی مجلس اتحاد المسلمین

مولوی ابوالحسن سید علی

نواب بہادر یار جنگ کی وفات سے حیدرآباد کی سیاسی زندگی میں خلا پڑ گیا۔ اگرچہ فضل حسین۔ مولوی ابوالحسن سید علی۔ مولانا مظہر علی۔ مولوی اکبر حسین انیس الدین، اور اکبر عالم کی طرح سینیئر[1] قائدین موجود تھے۔ لیکن بہادر خاں کے آفتاب قیادت کی چکا چوند کرنے والی روشنی میں ٹمٹماتے ہوئے چراغوں کا کیا مقام ہو سکتا تھا۔ نعم البدل کی تلاش جاری تھی۔ کسی کی شخصیت عوام کی نظر میں نہیں جچ سکتی تھی۔ تاہم کسی شخص کا انتخاب ضروری تھا۔ اس لئے اکابرین مجلس نے مولوی ابوالحسن سید علی ایڈوکیٹ کو مسندِ صدارت پر لا بٹھایا۔

مولوی صاحب نے نواب مرحوم کے بجائے کابینہ میں شامل ہونے کی کوشش کی۔ لیکن عوام میں اُن کو کوئی خاص مقام حاصل نہیں

---

[1] قاسم رضوی اس زمانہ میں جونیر ہی سمجھے جاتے تھے

تھا اور نہ حکومت پر اُن کا قابل لحاظ اثر تھا۔ اسی لئے اُن کی ساری کوششیں ناکام ہوگئیں، اور پھر حادثۂ دارالسلام[1] سے اُنھوں نے استفادہ کرنا چاہا۔ اور عدمِ تعاون اور مشاورتی کمیٹیوں سے مجلس کے نمائندوں کی علحدگی کی دھمکی دے کر کابینہ کی رکنیت کے بارے میں حکومت سے سودا کرنے کی سعی کی۔ لیکن عبداللہ المسدوسی[2] اور ان کے ساتھیوں (حزبِ[3] اختلاف) کے اختلاف سے اُن کی یہ کوشش

[1] دارالسلام اس عمارت کا نام ہے جہاں مملکتی مجلس اتحاد المسلمین کا دفتر واقع تھا۔ اُس کے کمپونڈ کے ایک حصہ میں ایک عمارت تھی جس پر سیف بن سلطان جو سلطان مکلّہ کے عزیز ہیں قابض تھے۔ اس قبضہ کے متعلق ایک عرصہ سے نزاع جاری تھی۔ اس زمانہ میں مجلس کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ رضاکاروں نے کسی اشتعال طبع کے باعث اس حصۂ عمارت پر قبضہ کرلینا چاہا۔ اس پر کچھ عرب جمع ہوئے اور مجلس کے کچھ لوگوں پر جن میں مولوی صاحب بھی شامل تھے حملہ کیا۔ مولوی صاحب بہت برانگیختہ ہوئے اور حکومت کو موردِ الزام کیا کہ مجلس کے وقار کو صدمہ پہونچانے کے لئے اُس نے یہ سارا فساد برپا کیا ہے۔

[2] عبداللہ المسدوسی بی۔اے۔ ایل ایل بی ایڈوکیٹ نواب بہادر یار جنگ کے ساتھی اور مجلس کے قدیم کارکن ہیں۔ اپنی بصیرت کے لئے سیاسی حلقوں میں خاص مقام رکھتے ہیں۔ علومِ اسلامی پر اُنھیں عبور حاصل ہے۔ چنانچہ پاکستان کی مجلس دستور ساز کے تعلیمات اسلامی بورڈ میں ان کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔

[3] حزبِ اختلاف میں یہ لوگ شامل تھے: (۱) عبداللہ المسدوسی (۲) کلیم الدین انصاری ایڈوکیٹ (۳) عبدالرؤف ایڈوکیٹ جو بعد میں حزبِ اختلاف سے علحدہ ہوگئے۔ لائق علی کابینہ میں بھی انھوں نے مجلس کی نمائندگی کی۔ (۴) محمد اعظم۔ (۵) عبدالکریم تمّاپوری ایڈوکیٹ۔ جو حیدرآباد ہی میں ہیں۔ حیدرآباد کی شکست کے بعد گرفتار کرلئے گئے تھے لیکن بعد میں رہا کردیئے گئے۔

بھی رائگاں ہو گئی، اور جب اُن کا رہا سہا وقار بھی متاثر ہونے لگا تو وہ حکومت سے سمجھوتہ پر مائل ہو گئے۔ میر لائق علی اور بابو خاں[1] نے مصالحت کے لئے اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کیا۔ حکومت نے اعلان کیا کہ:

"شر انگیز عناصر کی سرکوبی کی جائے گی"

اور مولوی صاحب نے دستِ تعاون دراز کر دیا۔

جنگ ختم ہو گئی تھی اور اصلاحات کے نفاذ کے لئے انتظامات کئے جا رہے تھے۔ لیکن حیدر آباد کی درباری سیاست کی گندگی سے تیقنات کے متعلق خطرات محسوس کئے جا رہے تھے۔ نواب بہادر خاں کی وفات کے روز نظام نے سازشوں کا جال بچھا کر نواب کی بیوہ سے تیقنات کے بارے میں اپنا مکتوب واپس حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن مولوی صاحب کسی طرح اُس کو اپنے نزدیک محفوظ کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ موجودہ صورت میں نظام اور[2] چھتاری حکومت تیقنات کو جو ابھی راز میں تھے جزوِ دستور بنانے کے لئے راضی نہیں تھے، اور مجلس اُن کے کسی وعدہ پر جن کو دستور کا درجہ حاصل نہ ہو بھروسہ کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔ رسّہ کشی جاری ہی تھی کہ مجلس دو گروہوں میں منقسم ہو گئی۔ مولوی صاحب

---

[1] میر لائق علی کی طرح بابو خاں بھی حیدر آباد کے مشہور سرمایہ دار ہیں۔
[2] دیکھئے صد

بہر قیمت کابینہ میں جانے کے آرزومند تھے، اور جب دو مرتبہ وہ ناکام ہوگئے تو اُنھوں نے سر[1] سالار جنگ کے توسط سے اسٹیٹ کانگریس کے اکابرین سے مندرجۂ ذیل اساس پر خفیہ عہد و پیمان کرلیا۔

۱۔ انتخابات علاقہ واری بنیاد پر ہوں نہ کہ مفاداتی بنیاد پر

۲۔ مقننہ کے اختیارات وسیع تر کیے جائیں

۳۔ مقننہ میں مسلم اکثریت نہ ہو۔

۴۔ کابینہ میں دو مسلم اور دو ہندو نمایندے لئے جائیں۔

مولوی صاحب نے اس معہودِ ذہنی کے ساتھ مجلس کے سالانہ اجلاس میں اصلاحات کے متعلق ایک قرارداد پیش کرنی چاہی۔ مجلس موضوعات میں کلیم الدین انصاری نے اس کی سخت مخالفت کی لیکن اجلاس عام میں یہ قرارداد منظور ہوگئی۔ مولوی صاحب کی خفیہ بات چیت کا علم عام ہوگیا۔ اختلافات بڑھتے چلے گئے۔ میر لایق علی اور بابو خاں نے مصالحت کی ناکام کوشش کی۔ نواب اکبر یار جنگ حکیم مقصود جنگ۔ نواب دوست[2] محمد خاں وغیرہ نے قرارداد اصلاحات کے خلاف بیان جاری کیا۔ زمرد محل میں ایک جلسۂ عام منعقد ہوا جس میں اس قرارداد کی مذمت کی گئی۔ "حزب اختلاف" نے اخباری

---

[1] سر سالار جنگ مرحوم بہت بڑے جاگیردار اور سرمایہ دار تھے۔ شیئر مارکٹ سے ان کے مفادات وابستہ تھے، اور اس تعلق سے کانگریسی سرمایہ داروں سے ان کے گہرے روابط تھے

[2] ان اشخاص کو مجلسی حلقوں میں "بزرگانِ ملت" کہا جاتا تھا۔

مہم شروع کی اور مجلس کے معتمد یاآمین زبیری اور متعدد دیگر اراکین عاملہ کو مولوی صاحب سے علحدہ کرلیا۔ اس ساری کشمکش سے رائے عامہ مولوی صاحب کے خلاف ہوگئی اور اُنھیں بالآخر مستعفی ہونا پڑا۔

شملہ کانفرنس

انگریزوں نے معاہدات کے ذریعہ نظام سے امورِ خارجہ حاصل کرلئے تھے، جن کی انجام دہی انگریز ریزیڈنٹ کے سپرد تھی۔ اس طرح حکومت حیدرآباد کی خارجہ حکمت عملی ایک عرصہ سے مفلوج ہوچکی تھی۔ اور چونکہ بیرونی دنیا سے کوئی ربط قائم نہیں تھا، اس لئے بیرونی سیاسی تحریکات اور دستوری صورتِ حالات سے حکومت اور عوام کا ناآشنا رہنا فطری امر تھا۔ دنیا کے بیشتر انقلابات اور بین الاقوامی ہنگاموں کے بہت کم اثرات حیدرآباد پر پڑ سکے تھے۔ اور انگریزوں نے کچھ اس طرح خوابِ غفلت میں ڈال دیا تھا کہ برصغیر ہند سے اُن کی اس قدر جلد علحدگی کا کوئی تصور ہی موجود نہیں تھا ــــــ اور اس طرح مستقبل میں حیدرآباد کے سیاسی مُوقف کو برطانوی حکومت کے ذریعہ متعین کرانے کا کوئی مستقل مسئلہ حکومت اور نہ مجلس کے پیش نظر تھا۔ قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ نے اس سلسلہ میں قدم اُٹھایا تھا۔ مگر یہ اُن کی محض شخصی کاوشں تھی جو اُن کی شہادت کے بعد اربابِ مجلس کی توجہات سے محروم ہوگئی!

والسرائے ہند لارڈ ویول نے ہندوستان کے سیاسی تعطل کو

رفع کرنے اور چالیس کروڑ انسانوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے کیلئے
جملہ جماعتوں کی ایک کانفرنس شملہ میں طلب کی، لیکن حیدر آباد کے
کسی نمائندہ کو اس میں مدعو نہیں کیا۔ اور نہ نواب چھتاری کی غفلت
شعار حکومت نے اس کے لئے کوئی کوشش کی۔ جب اس کانفرنس
کی روئداد دنیا بھر کے اخبارات میں آنے لگی، اور ہندوستان
کی سیاسی جماعتوں نے زور باندھنا شروع کیا تو مولوی صاحب
کو بھی اس کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ اور وہ اپنے معتمد یامین زبیری
کے ساتھ شملہ پہنچے۔ لیکن ان کی وہاں کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔
قائد اعظم سے بھی اُن کی ملاقات نہ ہو سکی، البتہ نواب زادہ لیاقت
علی خاں اور سردار عبدالرب نشتر نے ان سے گفتگو کی۔ اور یہ
بتایا کہ حیدر آباد کے لئے اس وقت شملہ کانفرنس سے زیادہ اہم مسئلہ
وزارتِ عظمیٰ کا ہے کیونکہ نظام یہ خدمت سر مرزا اسماعیل کو عطا
کرنے کے لئے وائسرائے سے مراسلت کر رہا ہے اور اگر وہ کامیاب
ہو جائے تو حیدر آباد کی آزادی کے لئے انتہائی خطرناک صورت پیدا
ہو گی، جو نہ صرف مسلمانانِ حیدر آباد بلکہ بالواسطہ مسلمانانِ ہند
کے لئے بھی سخت مضرت کا باعث ہو گی۔ انھوں نے بتاکید یہ مشورہ
دیا کہ جس قدر جلد ممکن ہو مرزا اسماعیل کے تقرر کی مزاحمت کی جائے
—— مولوی صاحب شملہ سے لوٹ آئے۔ اکابرینِ مجلس کے
سامنے مسئلہ کو پیش کیا اور اس بارے میں جدوجہد کا آغاز ہوا ہی تھا

کہ مجلس کا اندرونی تلاطم بپا ہوگیا، اور ساری توانائیاں اس سمت میں مصروفِ عمل ہوگئیں !!

مولانا مظہر "اصحاب خمسہ" کی جانب سے مولانا مظہر ایڈوکیٹ صدارت کے امیدوار تھے، اور ان کے مقابلہ میں قاسم رضوی کھڑے تھے۔ مجلس شوریٰ میں دونوں امیدواروں کو تقریباً مساوی تائید حاصل تھی۔ لیکن مولانا مظہر خفیف سی اکثریت کے ساتھ صدر مجلس قرار پائے

مولانا مظہر کا دورِ صدارت مجلس کی اندرونی کشمکش اور رسہ کشی کا دور رہے۔ ان کی رحم دلی سے متنازع جماعتیں فائدہ اٹھاتی رہیں اور خود مولانا کے مؤیدین میں بھی اختلاف رونما ہوا۔ عبدالرحمٰن رئیس مدیر روزنامہ "وقت" کی جماعت نے[1] عبداللہ مسدوسی کی جماعت سے علیحدگی اختیار کی اور حادثہ ڈچ پلی سے عوام میں ہیجان پیدا کر کے حکومت پر اپنا اثر قائم کرنے کی بے سود کوشش کی۔

رخنہ گری حادثہ شاہ منزل کے بعد نواب چھتاری مستعفی ہوگئے اور کشتیٔ دکن کے "ناخدا" نے اپنی فطرت اور درباری روایات کے مطابق رخنہ گری کی سازش مکمل کرلی۔ بہی خواہان سلطنت کسی دیانت دار اور دور اندیش سیاست داں کو وزارت عظمیٰ کے

---

[1] ڈچ پلی ایک قصبہ ہے جہاں عیسائی مشن نے مرض جذام کا ایک ہسپتال قائم کر رکھا ہے

منصب جلیلہ پر فائز دیکھنا چاہتے تھے۔ اور اس سلسلہ میں بار بار فیروز خاں نون کا نام لیا جا رہا تھا۔ لیکن نظام خود فریبیوں میں مبتلا تھا اس کے نزدیک مملکت کی بہبودی اور مسلمانانِ دکن کے مستقبل سے زیادہ اہمیت اس کی اپنی انانیت کو حاصل تھی۔ وہ ایک ایسے شخص کو منتخب کرنا چاہتا تھا جس کی ذات سے "جی حضوری" کی امید کی جا سکتی تھی اور اس کی

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) اس ہسپتال کے کمپونڈ میں مسلمان مریضوں نے نماز کے لئے ایک جھونپڑی بنالی تھی۔ جس کو ہسپتال کے منتظمین نے بعض وجوہ سے اٹھا دیا۔ لیکن اطلاع عام ہوئی کہ "مسجد" کو "شہید" کر دیا گیا ہے عوام میں ہیجان برپا ہوا، اور مجلس نے حکومت سے سخت احتجاج کیا۔ اس بارے میں مولانا مظہر نے عبدالرحمٰن رئیس کو جملہ اختیارات دیدیئے جنھیں نواب معین نواز جنگ نے منجانب عوام حکومت کو یقین دلایا کہ مسجد تعمیر کر دی جائے گی۔ اور نفس معاملہ میں تحقیقات بھی کی جائے گی۔ اس کے باوجود دوسرے روز مجلس میں ایک احتجاجی جلسہ منعقد کیا گیا۔ اشتعال انگیز تقریریں کی گئیں اور مشتعل مجمع نے شاہ منزل پہونچ کر نواب چھتاری کو زد و کوب کیا، اور سرکاری مال و اسباب کو نقصان پہنچایا۔ گریگسن (وزیر مال و پولیس) کے مکان پر بھی حملہ کیا گیا۔ اور عمارت کو سخت مضرت پہنچائی گئی۔ رئیس اور ان کے ساتھی گرفتار کر لئے گئے۔ اُن پر مقدمات چلائے گئے اور بالآخر عام معافی میں انہیں رہا کیا گیا۔

کوئی پرواہ نہیں تھی کہ "جی حضوری" سے ہٹ کر ملک کے لئے وہ کوئی مفید کام انجام دینے کا اہل ہوسکتا تھا یا نہیں۔ نیز دربار کی نچلی سیاست وار دھائی حکمت عملی سے بہت زیادہ متاثر ہو چکی تھی۔ اور مرزا اسماعیل نے پیر وار دھا کے اشارے پر وائسرائے کے توسط سے وزارتِ عظمٰی کے لئے درخواست پیش کردی تھی اور اس کے متعلق قائدِ اعظم وائسرائے اور نظام کے مابین مراسلت جاری تھی۔ مسلم رائے عامّہ مرزا اسماعیل کے خلاف تھی، کیونکہ میسور اور جے پور میں اُن کی مسلم دشمنی کے شاہکار کسی سے مخفی نہیں تھے۔ اور اس وجہ سے تکمیلِ ضابطہ کے لئے نظام قائداعظم سے بات کرنا چاہتا تھا۔

قائداعظم حیدرآباد میں چنانچہ حکومت حیدرآباد کی دعوت پر قائداعظم حیدرآباد گئے ـــــ مسلمانوں نے اپنی آنکھیں بچھا دیں، اور لاکھوں کے مجمع نے جو طیران گاہ سے گیسٹ ہوز تک پھیلا ہوا تھا۔ اسلامیانِ ہند کے سردار کا ایسے عقیدتمندانہ جوش و خروش سے استقبال کیا کہ تاریخ دکن میں اس کی مثال نہیں مل سکتی! ـــــ قائداعظم نے نظام سے ملاقات کی، جو ابتداءً درباری آداب و تکلفات کے جھوٹے تصورات میں اُلجھتا رہا اور پھر ذہنی تحفظات کے ساتھ غیر منطقی گفتگو کرتا رہا جس سے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوسکا۔ قائداعظم قیام گاہ لوٹ آئے اور قائدین مجلس کو بتایا کہ اس وقت مسلمانانِ دکن کو سب سے بڑا خطرہ نظام ہی کی طرف سے

لاحق ہے اور اندیشہ ہے کہ خود فریبیوں کے لئے وہ مسلمانوں کو بیچ دے گا۔ انھوں نے مجلس کی متنازع جماعتوں کو ہدایت کی کہ متحد ہوں اور متحد ہو کر مرزا اسماعیل کے تقرّر کی مخالفت کریں مجلس کے بعض اشخاص نے اُن سے تین مرتبہ ملاقات کی اور ہر مرتبہ اپنے مخالفین کے متعلق اعتراضات پیش کئے لیکن قائدِ اعظم ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ الزامات اور جوابی الزامات کا یہ محل نہیں ہے۔ اس وقت ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ مسلمانانِ دکن لوہے کی دیوار کی طرح مرزا اسماعیل کی راہ میں حائل ہوں، جو اپنے ساتھ تباہی و بربادی کا ایک طوفان لا رہا ہے ـــــ ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ ہونے کو ہے اور دکن پر داردھا کو مسلط کرنے کی سازش مرزا اسماعیل نے کر لی ہے ـــــ!

موت کی گھنٹی

لیکن قائدینِ مجلس میں خاطر خواہ اتحاد نہ ہو سکا اور نظام نے اختلافات سے فائدہ اُٹھایا۔ یہ پروپیگنڈہ کیا گیا کہ مرزا اسماعیل کو اپنی اُن حرکتوں کا احساس ہو گیا ہے جن سے مسلمانانِ میسور اور جے پور کو نقصان پہونچا ہے، اور وہ محض اس غرض سے حیدر آباد آ رہے ہیں کہ آخری عمر میں اپنے گناہوں کا کفارہ دے سکیں! ـــــ لطف تو یہ ہے کہ مجلس کے چند ذمہ دار قائدین بھی اس پروپیگنڈے کی رَو میں بہہ گئے، اور جب مجلس کی صفوں میں انتشار پھیل گیا تو نظام نے صورتِ حال کو اپنے لئے

سازگار پاکر عنانِ حکومت مرزا اسماعیل کے سپرد کردی ——— !
کمزوری نے حالات کے دھارے کو بدل دیا۔ سادگی نے تاریخ کی رَو
کو موڑ دیا اور ——— عالم غیب میں حیدر آباد کی موت کی گھنٹی بجا دی
گئی !!

اصلاحات حکومت کی جانب سے مقننہ کے انتخابات کے
لئے اعلان ہوا۔ اصحابِ خمسہ مصر تھے کہ حکومت سے
اُس وقت تک تعاون نہ کیا جائے جب تک کہ تیقنات کو جزو دستور
نہ بنا لیا جائے۔ اس کے برعکس قاسم رضوی کی جماعت انتخابات میں
اس غرض سے حصہ لینے کی حامی تھی کہ مقننہ میں داخل ہو کر حقوق
کی حفاظت کی جائے۔ نتیجتاً مجلس میں تعطّل کی سی کیفیت پیدا ہوگئی
اور مولانا مظہر نے طے کیا کہ اس کے متعلق قائدِ اعظم سے فیصلہ حاصل
کیا جائے۔

قائد اعظم کا فیصلہ مجلس کے ایک وفد نے جو اکرام اللہ۔ عبد الروف
اور عبد اللہ المسدوسی پر مشتمل تھا۔ قائدِ اعظم سے
ملاقات کی، جو ان دنوں بمبئی میں راست عمل (Direct Action ,)
پر غور فرما رہے تھے۔ اُنھوں نے مسئلہ کے ہر پہلو پر غور کیا اور مشورہ
دیا کہ تیقنات کو شائع کر کے انتخابات میں حصہ لیا جائے اور مجلس
کا پارلیمانی بورڈ دونوں جماعتوں کے ایسے نمایندوں پر مشتمل ہو جو مقننہ
کی رکنیت کے امیدوار نہ ہوں۔ چنانچہ قاسم رضوی کی جماعت کی

طرف سے اکرام اللہ نے اور دوسری جانب سے عبداللہ المسدوسی نے خود کو اس خدمت کے لئے پیش کیا۔ بورڈ کی صدارت خود مولانا مظہر کر رہے تھے۔ مولوی ابوالحسن سید علی بھی مقننہ کی رکنیت کے امیدوار تھے۔ لیکن قائداعظم کے مشورہ پر انھیں ٹکٹ دینے سے انکار کیا گیا ــــــ انتخابات ہوئے۔ بعض مقامات پر مجلس کے مقابلہ میں کچھ اشخاص کھڑے ہوئے، لیکن ہر جگہ مجلس کو شاندار کامیابی حاصل ہوئی ــــــ نظام اور اُس کی حکومت کو عامۃ المسلمین کے اتحاد اور استحکام کا اندازہ ہوا۔ عدیدیت کے قصر کے درو دیوار ہل گئے اور اجارہ دارانِ حکومت کے اندوختۂ فکر پہ بجلی گر گئی!!

ضربِ کاری

مسلمانوں کا یہ اتحاد مرزا اسماعیل کے مشن کے لئے خطرناک تھا، اور ایسی متحد و مستعد قوم کے ہاتھوں میں اسلحہ کی فراوانی اُس کی آزادی اور استحکام کی بہترین ضمانت ہو سکتی تھی۔ مجلس اور عوام کا ہمیشہ سے یہ مطالبہ تھا کہ ملک میں اسلحہ سازی کے کارخانے قائم کئے جائیں، اور فوج اور عوام کو عصری آلاتِ حرب سے مسلّح کرنے کے لئے ہر ممکنہ کوشش کی جائے لیکن مرزا اسماعیل نے اِن اُمور کو جو آزادیِ دکن کے تحفظ کے لئے ناگزیر تھے نظر انداز کر کے تصنّعات، تکلفات اور گڑیوں کے کھیل سے رائے عامہ کو فریب دینا چاہا۔ اُس نے شہر کی آرائش کے لئے

خزانہ کا منہ کھول دیا، ہر جگہ توڑ پھوڑ شروع ہوئی اور تعمیر کی حسن کاریوں اور برقی قمقموں کی رنگینیوں سے عوام کی نگاہوں کو خیرہ کرنے کی سعی کی گئی۔ اور جب حیدرآباد کی امریکن[2] چھاؤنی نے اپنے آلاتِ حرب کا عظیم الشان ذخیرہ، اور برطانیہ نے حیدرآباد میں قائم کردہ اپنی بے مثال برین گن[3] فیکٹری کوڑیوں کے مول حکومت حیدرآباد کے حوالے کرنے کا ایجاب کیا تو مرزا اسماعیل نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ حیدرآباد کو اسلحہ کی ضرورت نہیں ہے!! وہ جانتا تھا کہ اس طرح مسلح ہونے کے بعد دکن کی طرف ترچھی نگاہیں بھی ہندو انڈیا نہیں ڈال سکتا تھا، اور دکن میں برہمن بنیا راج کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا تھا۔ ——! اس انکار پر برطانیہ نے اپنی برین گن فیکٹری برطانوی ہند میں منتقل کر دی، اور امریکیوں نے رائفلوں، مشین گنوں اور ہلکے اسلحہ کو ٹینکوں سے روند ڈالا اور ٹینکوں اور آرمرڈ کاروں کو ڈائنامیٹ لگا کر پاش پاش کر دیا —— مرزا اسماعیل کی ان معاندانہ حرکات کے خلاف احتجاج کیا گیا لیکن ایک نہ سنی گئی اور سنہری مواقع ہاتھ سے نکل گئے۔ آزادی کی بقاء کے امکانات خطرناک حد تک کم ہو گئے اور سلطنتِ دکن کے ایک ایسی کاری ضرب لگی کہ آئندہ ہر تدبیر زخم پر

---

[1] اس نسبت سے مرزا اسماعیل کو حیدرآباد میں "مرزا توڑ پھوڑ" کہا جانے لگا۔

[2] جنگ کے زمانہ میں امریکہ نے یہ چھاؤنی حیدرآباد میں قائم کی تھی جو ہندوستان کی سب سے بڑی چھاؤنی سمجھی جاتی تھی۔

[3] ایشیاء کی یہ سب سے بڑی فیکٹری تھی۔

مرہم کا کام تو کر سکی لیکن اُس کو مندمل کرنے میں بالآخر ناکام ہوگئی!
مجلس کے سالانہ اجلاس بابتہ ۱۹۴۸ء میں تقریر کرتے ہوئے قاسم
رضوی نے انہی المناک واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔

"سب سے آخر میں مرزا اسمٰعیل نے آکر فریش حکومت کو مرحوم
کردیا۔ ہمارے اقتدار کو موت کے گھاٹ اُتار دیا اور اُس کو
تابوت میں رکھکر برہمن کے اقتدار کا آخری کیلا ٹھونکنا چاہا
.... اور پھر وہ برین گن فیکٹری کو ہندوستان کے
حق میں منتقل ہونے دے کر ملت فروشی کا بدنما داغ لیکر
دکن بدر ہوا۔"

تقسیم ہند شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد برطانیہ کی مزدور
حکومت نے آزادیِ ہند کے مسئلہ کے حل کی تلاش
کے لئے ایک وزارتی وفد ہندوستان بھیجا، جس نے مسلم لیگ کے
مطالبۂ پاکستان کو رد کرکے یہ سفارش کی کہ:۔

(الف) ہندوستان کا دستور وفاقی ہو، اور یہ وفاق حسب ذیل
تین اکائیوں پر مشتمل ہو:

(۱) صوبہ سرحد، پنجاب، سندھ اور بلوچستان
(۲) بنگال اور آسام
(۳) ہندوستان کے مابقی صوبے

(ب) ہر اکائی کو حکومتِ خود اختیاری اور دس سال کے بعد

بعد وفاقیہ سے علیحدگی کا اختیار حاصل رہے۔

(ج) وفاقی دستور کی تشکیل کے لئے ایک مجلس دستور ساز صوبائی مجالسِ مقننہ سے منتخب کی جائے، اور

(د) درمیانی عرصہ کے لئے ایک عوامی عارضی حکومت قائم کی جائے۔

مسلم لیگ نے اس تجویز کو منظور کیا اور کانگریس نے تو اس کو اپنی مکمل فتح پر محمول کیا۔ لیکن جب رفتہ رفتہ اس کے رموز منکشف ہونے گئے تو کانگریس نے انحراف شروع کیا اور یہ اعلان کیا کہ مجلس دستور ساز آزاد اور خود مختار جماعت ہو گی، اور وزارتی وفد کی ہر شرط سے بے نیاز ہو گی!۔ دوسری طرف مسلم لیگ صرف ایسی صورت میں مجلس دستور ساز میں جانے پر آمادہ تھی کہ وفاقی دستور جملہ شرائط کے تابع ہو۔ یہ کشمکش جاری ہی تھی کہ وائسرائے نے پنڈت نہرو کو عارضی حکومت کی تشکیل کی دعوت دی۔ پنڈت جی مسلم لیگ کا تعاون حاصل کرنے میں ناکام ہوئے، تاہم اُن کی حکومت قائم ہو گئی۔ وائسرائے نے مسلم لیگ سے مراسلت شروع کی، اور قائدِ اعظم کی شرائط کو منظور کر کے اُن کے پانچ نمایندے عارضی حکومت میں شامل کر لئے۔

مجلس دستور ساز کے اختیارات کے بارہ میں رسّہ کشی جاری رہی اور بالآخر یہ طے ہوا کہ برطانوی وزارت اور برطانوی ماہرینِ دستور

سے وزارتی وفد کی تجاویز کی تعبیر حاصل کی جائے۔ چنانچہ برطانوی حکومت کی دعوت پر پنڈت نہرو۔ بلدیو سنگھ، قائد اعظم اور لیاقت علی خاں لندن گئے ـــــ فیصلہ مسلم لیگ کے حق میں ہوا۔ لیکن پنڈت جی اپنی ضد سے باز نہیں آئے اور مجلس دستور ساز کی افتتاح کے لئے ہندوستان واپس ہو گئے۔ قائد اعظم لندن میں ٹھیرے رہے اور ایک مخصوص دعوت کے موقع پر برطانوی وزیر اعظم میجر ایٹلی اور اُن کے رُفقائے کار کو اپنی خداداد فہم و فراست اور ناقابل تردید دلائل سے قائل کیا کہ ہندوستانی مسائل کا کوئی حل بجز تقسیم ہند کے ممکن نہیں ہے ـــــ! ڈیول کو ہندوستان سے بلا لیا گیا اور اُن کی جگہ مونٹ بیٹن گورنر جنرل مقرر ہوئے جنھوں نے تقسیم ہند کے منصوبہ کو کانگریس کے سامنے پیش کر دیا ـــــ اس وقت تک گاندھی جی کا تدبر، پنڈت نہرو کی ضد، پٹیل کی دھمکی، اور راشٹریہ سیوک سنگھ کا اعلان جنگ ـــــ یہ سب کچھ اسلامیانِ ہند کو متاثر اور قائد اعظم کے قدم کو متزلزل کرنے میں ناکام ہو چکے تھے! رائے عامہ بیچین تھی، دستوری تعطّل سے عوام تنگ آ چکے تھے اور بجز ہتھیار ڈال دینے کے کانگریس کے لئے کوئی چارہ نہیں تھا ـــــ! ۳۔ جون ۱۹۴۷ء کی سنہری شام کو آل انڈیا ریڈیو نے حضرت اقبالؒ کے خواب کی تعبیر اہل جہان کے سامنے پیش کی، اور نیلی نیلی فضاؤں کے دوش پر رقص کرنے والی ایتھر کی موجوں نے مسلمانوں کے عزم اور قائد اعظم کی

بصیرت پر مہر تصدیق ثبت کی !!

۱۸ - جولائی ۱۹۴۷ء کو برطانوی پارلیمنٹ نے قانونِ آزادیٔ ہند بابتہ ۱۹۴۷ء منظور کیا - پاکستان اور ہندوستان کو قلمروی مرتبہ (Dominion Status) دیا گیا، اور اس امر کی وضاحت کی گئی کہ ان ممالک کی مجالس دستور ساز کو ہر قسم کا دستور وضع کرنے کی آزادی حاصل ہے - ریاستوں کے بارے میں اعلان کیا گیا کہ برطانوی اقتدارِ اعلیٰ برخاست ہو جائے گا اور ریاستی حکمرانوں کو اختیار حاصل ہوگا کہ وہ آزاد رہیں یا دونوں قلمروؤں میں سے کسی ایک میں شریک ہوں -

انگریز کی بے وفائی سیاست میں دھوکہ بازی اور بے وفائی انگریز کی فطرت ہے جو ہندوستان میں اُس کی زندگی کے آخری لمحات تک باقی رہی —— مملکت حیدرآباد کے اُس پر بے انتہا احسانات سے تاریخ ہند پٹی پڑی ہے اور ہندوستان پر اُس کی ڈیڑھ سو سالہ حکمرانی اور ساری دنیا پر اُس کا اثر و نفوذ دراصل دکن کی وفاشعاریوں ہی کا رہینِ منت تھا - اِس حقیقت کا اُس کو اعتراف تھا لیکن چیتا اپنے دھبّوں کو کس طرح بدل سکتا؟ اُس نے حیدرآباد کے حق خود ارادیت کو تسلیم تو کر لیا، لیکن اُس کے نفاذ کے لئے امکانات کو محدود تر کر دیا - اُس نے حیدرآباد سے حاصل کردہ علاقہ جات اور بندرگاہوں سے اپنے اقتدار کی برخاستگی کا

اعلان کیا اور اُن پر حیدر آباد کے حق اور سیادت کو تسلیم کیا لیکن ان علاقہ جاتؔ[1] کو حیدر آباد کے حوالے یا اُن کو حاصل کرنے کی قوت عطا کیۓ بغیر یا خود موجودہ مؤقف کی حفاظت کے ذرائع واپس کیئے بغیر اُس نے حیدر آباد کو ایسی حالت میں چھوڑ دیا جبکہ ہندو انڈیا کے حصہ میں آئی ہوئی کثیر فوج حیدر آباد کے قلب میں موجود تھی ——! پارلیمنٹ میں اُس نے کہا کہ حیدر آباد کو آزاد رہنے کا حق حاصل ہے لیکن اُس کے نمائندہؔ[2] نے دہلی میں ببانگِ دہل اعلان کیا کہ حیدر آباد کو ہندو انڈیا میں شریک ہونا پڑے گا! اُس نے نہ صرف یہ اعلان کیا بلکہ اپنی واپسی تک شرکت پر وہ اصرار کرتا رہا، اوچھے ہتھیار استعمال کرتا رہا اور دھمکیاں دیتا رہا —— کیوں؟ —— اس لئے کہ ایشیا میں کمیونسٹ روس کی بڑھتی ہوئی طاقت اور اُس کے ترقی پذیر اثرات کی روک تھام کے لئے ہندو انڈیا ہی کو استعمال کیا جا سکتا تھا اور اس غرض کی تکمیل میں ہندو انڈیا ہی کو استعمال کیا جا سکتا تھا اور اس

---

[1] اضلاع شمالی سرکار جن میں بندرگاہ مچھلی پٹم بھی شامل ہے، سنہ ۱۸۰۰ء میں ایک معاہدہ ہوا تھا جس کی رو سے انگریزوں نے ذمہ داری لی تھی کہ اس علاقہ کی آمدنی سے وہ ایک فوج قائم رکھیں گے جو صرف حیدر آباد کی حفاظت کے لئے مختص ہوگی۔ یہ معاہدہ آج تک منسوخ نہیں ہوا اور نہ یہ علاقہ انگریزوں نے کبھی واپس کیا۔

[2] ماؤنٹ بیٹن۔

غرض کی تکمیل میں ہندو انڈیا کی خوشنودی اُس کو منظور تھی! اس خوشنودی کی خاطر اُس نے اپنے "یارِ وفادار[1]" کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔! اور صرف بے یار و مددگار ہی نہیں چھوڑا بلکہ برہمنی جوعِ ارضی کی قربان گاہ پر خاموش تبسم کے ساتھ بھینٹ چڑھا دیا!! اسی بے وفائی پر تبصرہ کرتے ہوئے قاسم رضوی نے ارشاد فرمایا:۔

انگریز! کیا تجھے غدر کے واقعات یاد نہیں، تیرے عورتوں اور بچوں کی حالتِ زار یاد نہیں؟ کس نے تجھے پناہ دی، کس نے سینہ سے لگایا اور کس نے تجھ سے دوستی کی؟——

دیکھ قدرت کے انتقام کو دیکھ، آہ رسا کو دیکھ! تیرا مقام آج اقوامِ عالم میں کیا ہے؟ منجدھار میں تو نے اپنے دوست کو دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور بادبان اور چپو کو توڑ دیا—— اپنی بے وفائی کے داغ کو دھونے کے لئے حقِ آزادی کا اعتراف تو کیا لیکن بالکل اسی طرح جس طرح صیّاد پر توڑ کر کبوتر کو چھوڑ دے، ظالم شکاری زخمی ہرن کو چھوڑ دے—— تو نے حیدرآباد کی آزادی کا اعلان پارلیمنٹ میں کیا لیکن تیرے نمائندہ نے دہلی میں اس کے برخلاف عمل کیا—— ہم نے غلطی کی جو کافر کو مسلمان سمجھا!—— اب بھی وقت ہے کہ تو اپنے دامن کو حیدرآباد کے خونِ ناحق سے بچالے.........

---

[1] یہ خطاب حکومت برطانیہ نے نظام کو عطا کیا تھا۔

ہمارا جذبۂ آزادی باقی ہے تو چاہے تو مدد کرے یا نہ کرے،
ہمارا جذبۂ بے اختیار قائم ہے، چاہے تو ہماری کشمکش میں اعانت
کرے یا نہ کرے۔"

(خطبۂ صدارت اجلاس مملکتی مجلس اتحاد المسلمین منعقدہ ۱۹۴۸ء)

نظام کا اعلانِ آزادی

۳- جون ۱۹۴۷ء کی تجویز نے حیدرآباد کے سمندِ آزادی کو مہمیز لگایا۔ اور آزاد حیدرآباد کا نعرہ ہر سمت سے بلند ہوا۔ عوام کا جوش و خروش بڑھتا گیا، جلسوں اور جلوسوں کا ایک لامتناہی سلسلہ قائم ہو گیا اور حالات سے متاثر ہو کر نظام نے اعلان کیا کہ دکن کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مخصوص روایات کے مدنظر مملکت حیدرآباد کا آزاد رہنا ہی برصغیر کے امن و فلاح کا ضامن ہو سکتا ہے ـــــ اگر پاکستان میں شرکت کی جائے تو میری ہندو رعایا کے لئے ناگوارِ خاطر ہوگا، اور ہندوستان میں شرکت سے مسلمانوں کے جذبات کو صدمہ پہونچے گا۔ اس لئے میں اعلان کرتا ہوں کہ میں آزاد رہوں گا اور میری مملکت آزاد رہے گی۔ میں پاکستان اور ہندوستان دونوں سے دوستانہ تعلقات قائم کروں گا اور بالخصوص اپنی ہمسایہ حکومت سے ہر معاملہ میں تعاون کروں گا، بجز اس کے کہ پاکستان سے جنگ کی صورت میں غیر جانبدار رہوں گا ـــــ!

قاسم رضوی اور لائق علی کا بنیہ پر مخالفین یہ اعتراض کرتے ہیں

کہ اُن کے رعب و اثر سے نظام نے آزادیِ حیدرآباد کا اعلان کیا تھا
لیکن تاریخ کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ یہ اعلان اُس وقت کا ہے جبکہ نہ
قاسم رضوی کو اقتدار حاصل تھا اور نہ لائق علی کابینہ برسرِ حکومت تھی ــــ
کسی حکمران کی آزاد رہنے کی تمنا ایک فطری امر ہے، اور بقائے آزادی
کے لئے اُس کی جدوجہد فطرت کے عین مطابق ہے ...... یہ اور بات
ہے کہ کسی انسان کو خواہ وہ بادشاہ ہی کیوں نہ ہو، دھوکہ دے کر پھانس لینا
اور کسی مملکت کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دینے کے لئے سازش
کرنا ہر دور اور ہر ملک میں ممکن ہے!

قاسم رضوی کا انتخاب

لیکن اِس وقت کشتیِ دکن گرداب میں تھی، نواب چھتاری نے اس کے بادبان کو چاک
چاک کر دیا تھا، اور مرزا اسمٰعیل نے اس کو متلاطم سمندر میں ڈال دیا تھا،
مسلمانانِ دکن کی بے چین نگاہیں ایسے ناخدا کو ڈھونڈھ رہی تھیں جو
کشتی کو ساحلِ مراد تک پہنچا سکے ــــ! حالات کی نزاکت مردِ خدا بیں
و خود آگاہ کی طالب تھی اور ملک کی آزادی مردِ جفاکیش و ہنرمند کی
متقاضی تھی ــــ! قاسم رضوی کی مجاہدانہ زندگی اور قلندرانہ روش
عوام کے سامنے تھی۔ اُن کی نگاہِ بلند، اُن کے سخنِ دل نواز اور اُن کی

---

[1] ماؤنٹ بیٹن کے مشیرِ دستوری کیمبل جانسن نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے، کہ نظام اپنی آزاد مرضی اور اپنی خواہش سے دکن کی آزادی چاہتا تھا۔

جان پُرسوز نے انسانی قلوب کی گہرائیوں میں اُن کے لئے جگہ پیدا کردی تھی۔ میں نے دیکھا ہے کہ قوم کے مستقبل کو درخشاں کرنے کی فکر میں اُن کی زندگی کی راتیں کبھی رومی کے سوز و ساز اور کبھی رازی کے پیچ و تاب میں گزرتی جارہی تھیں! کبھی اُن کی فکر حکیمانہ مسائل کی تہ تک پہنچ جاتی اور کبھی اُن کا جذبِ کلیمانہ تاریک نقابوں کو مستقبل کے چہرہ سے اُٹھاکر اس کو روشن اور تابدار کردیتا!! ـــــ قوم کی نگاہیں بار بار اُن پر پڑتی رہیں اور بالآخر ۱۹۴۷ء میں انیس الدین[1] اور عبدالرحمن رئیس کے مقابلہ میں وہ مملکتی مجلس اتحادالمسلمین کے صدر منتخب ہوگئے!

عوامی وزراء

مقننہ کے انتخابات کے بعد حسب اعلان حکومت کابینہ میں دو عوامی وزراء کا لیا جانا ضروری تھا۔ چنانچہ مجلس کی جانب سے عبدالرحیم ایڈوکیٹ اور ہندوؤں کی جانب سے پرجا پارٹی کے لیڈر پنگل[2] وینکٹ راما ریڈی کو نامزد کیا گیا۔ مرزا اسماعیل نے اس نوبت پر بھی مسلمانوں کی مرکزیت کو صدمہ پہنچانا چاہا۔ اُس نے بلاتوسط مجلس عبدالرحیم کو کابینہ میں شرکت کا دعوت نامہ بھیجا۔ لیکن عبدالرحیم کی مجلس سے وفاشعاری نے اس کو ناپسند کیا اور مرزا اسمٰعیل کو مجلس کا توسط اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اسٹیٹ کانگریس نے انتخابات کا بائیکاٹ کیا تھا

---

[1] انیس الدین ایڈوکیٹ، مجلس کے قدیم کارکن اور حزب اختلاف کی جانب سے امیدوار تھے، آجکل حیدرآباد ہی میں مقیم ہیں۔

[2] پنگل وینکٹ راما ریڈی بھی عرصہ تک قید رہے اور اس کے بعد رہا کردیے گئے۔

تاہم ہندوؤں کی اکثر نشستوں کے لئے بڑے دھوم دھام سے انتخابات لڑے گئے۔

مرزا اسماعیل کی تباہ کاریاں

برین گن فیکٹری اور امریکی اسلحہ سے حیدرآباد کو محروم کرنے کے بعد مسلمانوں کو کمزور سے کمزور تر کرنے کے لئے مرزا اسماعیل نے کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ اُس نے اُن کے سات سو سالہ اقتدار اور سیاسی برتری کو متاثر کرنے کی غرض سے اُن تیقنات کو سپردِ طاقِ نسیاں کردیا، جو قائدِاعظم کی کوششوں سے ۱۹۳۹ء میں نظام نے مجلس کو عطا کئے تھے نیز مذہبی امور میں حکومت کے نامزد کردہ مسلم اراکینِ مقننہ کے حق رائے دہی کو ساقط کردیا۔ مقننہ کی افتتاح کے موقعہ پر مسلم جماعت کے لیڈر کی حیثیت سے تقریر کرتے ہوئے قاسم رضوی نے ان تباہیوں کا اس طرح جائزہ لیا ہے:۔

"بندگانِ عالی کا پیام ہم نے نہایت ادب واحترام اور عقیدت کے ساتھ سننے کا شرف حاصل کیا اور جذبۂ وفاشعاری کے ساتھ ہم اس پر آمنّا و صدّقنا کہتے ہیں، اور اپنے اقتدار کے بلند پایہ مظہر کے ارشاد پر آہنی عزم کے ساتھ اپنے خون کے آخری قطرہ کا ناچیز پیشکش لئے ہوئے لبیک کہتے ہیں اور وعدہ کرتے ہیں کہ جب تک ملک کی سرزمین پر ۲۵ لاکھ مسلمان اور اُن کی آنیوالی نسلیں موجود ہیں سلطنتِ اسلامیہ کے وجود کو باقی، اُس کی

قوت کو مستحکم اور عظیم تر رکھیں گے۔ جناب عالی! امرزا اسمٰعیل
سے مخاطب ہو کر) پیام ہمایونی ہمارے لئے جس قدر امید افزاء
تھا، جناب کی تقریر اُتنی ہی مایوس کن رہی۔ جس آئین کا عنوان
وعدہ خلافی ہو، جس مقننہ کی افتتاح مسلمانوں کے صدیوں کے
اقتدار کی تقسیم سے ہو، ظاہر ہے کہ مسلمان کس طرح اُس
آئین سے راضی، اُس مقننہ کے آغاز سے خوش ہو سکتا
ہے۔ جناب کا ارشاد ہے کہ اسکیم اصلاحات بابتہ ۱۹۳۹ء
کو اعلیحضرت بندگان عالی نے شرفِ منظوری عطا فرمایا۔
لیکن حالاتِ جنگ کی وجہ سے اُسے رو بہ عمل نہیں لایا
گیا، اور اس دوران میں مرورِ زمانہ کا لحاظ کرتے ہوئے
ممالک محروسہ کی سیاسی جماعتوں اور گروہوں کے پیش
کردہ مطالبات کے مدنظر شاہ ذی جاہ کی منظورہ اسکیم پر
نظر ثانی کی گئی، چنانچہ موجودہ آئینِ مجلس مقننہ اسی نظر ثانی
کا نتیجہ ہے، ـــــ کیا مجھے پوچھنے کی اجازت ہوگی کہ کیا
یہ حقیقت پر مبنی ہے، اور اگر یہ حقیقت پر مبنی ہے تو شاید
جناب مسلم قوم کی واحد سیاسی جماعت مجلسِ اتحاد المسلمین
کو نہ جماعت تصور کرتے ہیں اور نہ ایک گروہ کہلائے جانے
کے قابل سمجھتے ہیں۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۶ء تک بلکہ آج
کی تاریخ تک مسلم قوم کی سیاسی جماعت کا کونسا مطالبہ تھا۔

جس کے مدنظر اس اسکیم کی دفعات پر نظر ثانی کی گئی - یہ
آئین مجلس مقننہ ہمارے کسی مطالبہ پر نظر ثانی کا نتیجہ نہیں ہے
بلکہ ہمارے مطالبہ سے نظر اول کو پھیر لینے کا نتیجہ ہے (آتا ایا)
جس اسکیم اصلاحات کو اعلحضرت بندگانِ عالی نے ۱۹۳۹ء
میں شرفِ منظوری عطا فرمایا تھا اس اسکیم کو اپنی نوازشات
اور عنایات سے مسلمانوں کے باقی ماندہ حقوق کے تحفظ
کے لئے چند تیقنات عطا کر کے محفوظ بھی فرمایا تھا ــــ
ہمارے مطالبات پر نظر ثانی تو کیا، قبول اور منظور کئے
ہوئے مطالبات تک کو نسیاً منسیا کر دیا گیا! ــــ
کیا مجھے یہ پوچھنے کی اجازت ہوگی کہ ملکِ دکن کے بہت
بڑے مگر مظلوم، مردود، مجبور، مفلوج مقہور بلکہ قریب
قریب مرحوم گردہ یعنی پست کردۂ اقوام کے کون سے
مطالبہ پر نظر ثانی کی گئی! ــــ اور یہ نقشِ ثانی کہاں سے
اور کس طرح نقشِ اول سے اُن کے حق میں بہتر ہے!
نظر ثانی کے اس قابلِ افسوس نتیجہ کو دیکھکر یہ خیال یا یہ
یقین کو پہنچتا ہے کہ حکومت کی نظر میں اگر کوئی سیاسی
جماعت ہے اور کوئی گروہ ہے، تو وہ وہ ہے جس نے
زمانۂ ماقبلِ تاریخ سے انسانیت کو بہیمیت کے درجہ تک
پہنچایا، اور قدرت کی اعلیٰ و بلند مخلوق کو پست کر دیا. کیونکہ

آئینِ مقننہ میں اگر کوئی تبدیلی ہے تو انہی جماعتوں اور اعلیٰ ذاتوں کے لئے ہے!——

جناب نے نظرِ ثانی کے متعلق ارشاد فرمایا کہ اب یہ تمام امور تاریخ کا جزو بن چکے ہیں، اور اب مجھے ان پر نظرِ ثانی کی ضرورت نہیں۔ میں آپ سے متفق ہوں، خدارا ایسا ہی کیجئے اور پھر اس تاریخ کو آپ اب نہ دُہرائیے۔ جنابِ والا! آپ کا یہ اعتراف کہ کسی کا حتیٰ کہ حکومت کا بھی یہ دعویٰ نہیں ہے کہ یہ دستور ترقی کی جانب ایک قدم، ایک شاندار تجربہ نہیں ہے .... تو حکومت آصفی کے دیرینہ اور مفید طرزِ حکومت اور روایات اور شاندار ماضی کو اس انوکھے تجربہ کا تختۂ مشق بننے کا شرف ہی کیوں بخشا ؟—— "تو مشق ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر"...... لیکن مسلمانوں کی گردن اب تختۂ مشق بننے کے لئے آمادہ و تیار نہیں ہے!—— کبھی نہ بجھنے والی پیاس کو بجھانے کا اور کبھی نہ تشفی پانے والی خواہش کو پورا کرنے کا کسی کو ختم کرلے تک ختم نہ ہونے والے مطالبات کی تکمیل کا ارادہ ؟ یہ کیا ہے ؟ دراصل مرعوب ذہنیت نے ہوسناکیوں کے لئے تمت کا کام تو نہیں کیا بلکہ ھل من مزید کیلئے گنجائش پیدا کردی ہے!

آپ نے کہا کہ ممکن ہے کہ یہ دستور اُن لوگوں کو مایوس
کن بلکہ بے معنی معلوم ہو جو ایک خاص طریقہ سے سوچنے
اور جمہوریت کے ایک رسمی مقررہ سانچے کے دیکھنے کے عادی
ہیں - جناب والا! میں ایک خاص طریقہ سے سوچکر اور
جمہوریت کے ایک رسمی مقررہ سانچے کو دیکھکر مایوس
نہیں ہو رہا ہوں ۔ بلکہ آپ کے ارشاد کے مطابق حقیقت
پسندانہ نظر سے دیکھ رہا ہوں اور مایوس ہو رہا ہوں - آئین
کے اس سارے مجاز میں میرے لئے صرف ایک حقیقت
تھی .... میرے صد فی صد میں سے جو کچھ لے لیا گیا تھا
وہ مجازیت تھی، اور جو کچھ محفوظ کر دیا گیا تھا وہ حقیقت تھی
جو اب صرف حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے دیکھکر بھی مجھے
اس مسودۂ دستور ساز میں نظر نہیں آتی! ـــــ ممکن
ہے جن حضرات نے اس کو چلانے کی ذمہ داری قبول
کی ہے اُن کے لئے یہ دستور زبردست اہمیت کا حامل
ہو - لیکن میں نے اور میری جماعت نے کبھی اور کہیں اس
کو چلانے کی ذمہ داری قبول نہیں کی ہے، اس لئے میرے
لئے یہ دستور کسی زبردست اہمیت کا حامل نہیں ہے . بلکہ بقول
آپ کے آپ کا انوکھا مگر میرے لئے مضرت رساں تجربہ ہے!
میری حق بین نظر کے لئے فنا کردہ حقیقت کو پھر سے حقیقت

بنا دیجئے اور اس کو چلانے کی ذمہ داری ہی نہیں مجھ سے عزم مصمم لے لیجئے، ورنہ مجھ سے دوسرا عزم مصمم لے لیجئے کہ میں اس کو چلاؤں گا تو نہیں، بلکہ جب تک آئین کی اس باد بان شکستہ کشتی میں تیقنات کے بادبان نہ لگالوں، یہ کشتی آگے بڑھ ہی نہیں سکتی!

جناب والا! میرے دعووُں کو بے دلیل نہ سمجھیئے، اس لئے کہ مدعی صرف دعویٰ کر کے ڈگری حاصل نہیں کر سکتا تو کم از کم میرے دعوے کو آزاد گواہوں کے بیانات کی روشنی میں جانچیئے۔ ۲۹ لاکھ پست اقوام کے اُن قائدین کے جن کو آپ نے اُن کا نمائندہ تسلیم کیا ہے، بیانات کو دیکھئے، لنگایت قوم کے قائدین کی حق پسندانہ تحریروں سے مدد لیجئے - پرجا پارٹی کے لیڈروں کی عملی سیاست پر مبنی استدلالات پر غور فرمائیے، اور اس کے بعد آپ طے کر دیجئے کہ مسلمانوں کا یہ دعویٰ حصول تیقنات واجبی اور توڑا ہوا دعدہ مستوجب تکمیل ہے یا نہیں ـــــ میرے عزیز وطن کے عزیز بھائیوں کے اقوال کو آپ صحیح مانیں گے جن کے دلوں میں وطن کی محبت ہے، اور جو وطن کو پُر امن، سر سبز و شاداب دیکھنا چاہتے ہیں یا پھر اس برہمن ساہوکار کانفیڈریسی کی باتوں پر اعتماد فرمائیں گے جو میرے آزاد وطن کو برہمن سرمایہ دار

کانگریس کے ہندوستان پر برہمن راج کے قیام کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانا چاہتے ہیں؟ ——— (مرزا اسماعیل کے چہرہ پر ایک رنگ آتا اور ایک جاتا رہا)

مجھے آپ سے انصاف کی توقع تھی جو پوری تو نہیں ہوئی ——— کیا اب بھی میں اس توقع کو جاری اور باقی رکھوں، یا مایوس ہو جاؤں، میں اب بھی آپ کی حقیقت بینی سے مایوس نہیں ہونا چاہتا۔ جناب کے ارشادات سے میں متفق ہوں کہ یہ دستور نہ تو نئی دلّی یا ویسٹ منسٹر کے نمونہ پر مرتّب ہوا، نہ جمہوریت کے کسی خیال یا ناقابلِ عمل نظریہ سے ماخوذ ہے، بلکہ ممالک محروسہ میں زندگی کی ٹھوس حقیقت پر مبنی ہے۔ مجھے بھی ایک ٹھوس بلکہ فولادی حقیقت عرض کرنے دیجئے جس کو دکن کی سات سو سالہ حکومت نے سنگینیت دی ہے۔ مسلمانوں کا صدیوں تک حاکم رہ کر محکوم نہ بنایا جا سکنا ایک ٹھوس حقیقت ہے اور محکوم بننے دینے کی صورت میں کسی حاکم کی حاکمیت کو ختم کرنے کا عدم ارادہ اس سے زیادہ ٹھوس حقیقت ہے۔ آپ بھی میری مدد کیجئے کہ پہلی حقیقت باقی رہے تاکہ دوسری حقیقت کے خود بخود آ جانے کا سوال باقی نہ رہے ——— جناب والا۔ آپ نے کیا ہی اچھی اور اُصولی بات فرمائی جب ارشاد ہوا کہ بنیادی حقیقت یہ ہے

کہ انسان کو زندہ رہنا چاہیئے، اور جمہوریت ایک سیاسی
طریقۂ زندگی سے زیادہ کچھ اور نہیں ہے جو آزادی کے لئے،
زندگی کے لئے، دوسرے تمام معلومہ طریقوں کے مقابلہ میں
زیادہ ممد و معاون سمجھا گیا، اور اس اُصول کی روشنی میں
اب کوئی شبہ نہیں کہ جمہوریت کے بنیادی اُصول حاصل ہوگئے
— لیکن اس اصولی بات کو قبول کر لینے کے لئے ہندوستان
کی موجودہ مسموم ہواؤں کے دھارے پر دکن کی دس سالہ فرقہ
وارانہ تعصب کی گھٹاؤں میں مجھے صرف اتنا یقین دلا دیجئے کہ
میں بہار کے انسانوں کی طرح انسان نہ سمجھا جاؤں گا، بلکہ حقیقی
معنوں میں انسان ہوں اور جام مرگ پی کر مجھے زندہ نہ رہنا چاہیئے
بلکہ جام حیات پی کر زندہ رہنا چاہیئے۔ اگر اس طرز جمہوریت
میں میرے لئے انسانیت اور حیات دونوں موجود ہیں۔
تو یہ دستور مجھے منظور ہے، ورنہ آج نہیں، کل نہیں، اور
کبھی نہیں! — میرے اس انکار کو آپ کے اس ارشاد
کی تائید حاصل ہے کہ ہمیں معلوم ہے کہ مقننہ میں اپنی اکثریت
کا یقین ہوتے ہی۔ ایک نام نہاد ذمہ دارانہ حکومت نہایت
غیر ذمہ دارانہ طرزِ عمل اختیار کر سکتی ہے۔ کیا جناب والا یہ
معلوم رکھتے ہوئے مجھے اقلیت کی گھٹی ہوئی حیثیت میں لاکر کسی
اور کو اکثریتی حیثیت کا یقین دلائیں گے۔ اور میرے جذبات

اور مفادات کو نظر انداز کرنے کا موقع پیدا کر دیں گے ؟ ـــ
مجھے یقین ہے کہ آپکے اس قول میں جان ہے اور اگر ہے تو
آپکے تذبذب کیوں ؟ بسم اللہ کیجئے اور یہ اعلان کیجئے کہ
تیقنات آئین ہی کے ذریعہ متعین کر دیئے گئے ہیں جیسکے ایک
جزو کے متعلق معتمد صاحب خصوصی نے مجھے یہ تیقن دلایا
کہ وہ آج شام تک تحریراً بھیج دیں گے ورنہ میں اور میری
جماعت آج یہاں حاضری کا شرف حاصل نہیں کرتے۔"

"میرے حصّے کی فہرست (اراکین مقننہ کی فہرست) میں
آپ نے ایسے ناموں کی تعداد بھی لکھدی ہے جن کو میں
مسلمان سمجھتا ہوں، اور عبداللہ، عظمت اللہ، اور حسین علی
کو اپنا بھائی سمجھکر بغلگیر ہونا چاہتا ہوں تو آپ مجھے روک دیتے
ہیں کہ خبردار یہ مسلمان نہیں ہے۔ ان کا دین وایمان نہیں
ہے، بلکہ ان کا مذہب "سرکاری ملازمت" ہے اور کسی
مسلمان سے ان کو ملنے کی اجازت نہیں ہے !"

مرزا اسماعیل نے مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں سے جو اُن
کا واحد ذریعۂ معاش تھا محروم کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی طرف اشارہ
کرتے ہوئے قاسم رضوی نے فرمایا:۔

"ہم فاقے نہیں کریں گے، ملک کی تجارت اور زراعت پر ابنائے
وطن قابض ہیں۔ ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ ہمارے دو سو اوطان

کو بڑھایا جائے، اور اُن کے تیس ہزار اوطان کو گھٹا کر اُن کی مساوی تقسیم کردی جائے۔ ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ ہمارا پیٹ کاٹ کر سرکاری ملازمتوں میں اُنھیں نصف کا حقدار نہ بنایا جائے ــــــ یا پھر ابنائے وطن کے ذرائع معاش میں ہمیں بھی نصف کا حقدار بنادیا جائے، یا اُس وقت کا انتظار کیا جائے جبکہ رفتہ رفتہ ہم بھی ان ذرائع معاش میں نصف حصہ حاصل کرلیں۔ ــــ کیا حکومت کا یہ فرض نہیں ہے کہ سقیم طبقہ کو اُبھارے؟ اور کیا اس کی یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ فاقہ کشوں کی روٹی کا انتظام کرے؟ اگر ہے تو پھر کسی کے غیض وغضب کا اندیشہ کیوں؟ آپ کی رعایا ہونا ہمارے لئے پیامِ موت کیوں ہو؟ آپ کی قوم ہونا باعثِ حرماں نصیبی کیوں ہو؟"

آزادیِ تقریر وتحریر کے پردہ میں مرزا اسماعیل نے باغی عناصر کی ہمت افزائی شروع کی تھی۔ متعدد کانگریسی اخبارات کو اجازت نامے دیئے گئے اور اشتعال انگیز مقررین سے پابندی اُٹھا کر یہ پابندی مسلمانوں پر عائد کردی گئی۔ اس کے متعلق قاسم رضوی نے اسی مقننہ میں احتجاج کیا:۔

"جناب والا! آپ ہمیں سیدھی سادی آزادیاں دینے پر آمادہ ہیں تو یہ ہمیں منظور ہے۔ ہم بھی پیچیدہ قسم کی آزادیاں نہیں لینگے جو دوسروں کے لئے بربادیاں بن جائیں۔ ہمیں بھی تقریر وتحریر کی آزادیاں دیجئے۔ ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہمسایہ کو بُرا بھلا

نہ کہیں گے نہ کسی حقیقت کی تحریف کریں گے۔ مگر ہمیں سیاہ کو سیاہ اور سفید کو سفید کہنے کی تو اجازت ہوگی۔ آج آپ کے دورِ صدارتِ عظمیٰ میں سینکڑوں اخباروں کو اجازت مل گئی لیکن منتِ کشِ قبولیت نہ ہوئی تو مجلس کی اجرائی اخبار کی اجازت کی درخواست! ـــــ مسز ارونا آصف علی تو آپ کے بتائے ہوئے معیار کی دوسری بدترین، دل شکن، غیر مہذب اشتعال انگیز، باغیانہ تقریریں کر کے عامرہ[1] کی سربراہی کی مستحق قرار پائیں اور ـــــ

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

ہم عبادت کی آزادی کے طالب ہیں۔ میں اربابِ حکومت کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ اپنے دو صد سالہ ریکارڈ میں بتادیں کہ کیا کبھی کسی مسلمان نے کسی دیول، گرجا یا کسی عبادت گاہ میں عبادت کرنے والوں کی عبادت میں نعرے لگائے؟"

وار دھائی اشاروں پر اُردو زبان کو مدارس سے برخاست کرنے کے لئے مرزا اسمٰعیل نے تدبیریں اختیار کیں۔ اس کے متعلق قاسم رضوی نے کہا:۔
"سب کی مشترکہ زبان اُردو ہے جس نے ملک کی وحدت کو قائم رکھا ہے

---

[1] "عامرہ" حکومت حیدرآباد کا ایک محکمہ ہے جو مہمانوں کے انتظام اور سربراہی کا بھی ذمہ دار ہے۔

اگر مختلف زبانوں میں طریقۂ تعلیم کو رائج کر کے ملک کو مختلف منطقوں اور صوبوں اور گروہوں میں تقسیم کرنے کی نیت ہو تو ہمیں ابھی جاہل رہنے دیجئے۔۔۔ ایسے علم سے ملک کو متحد رکھنے والی جہالت اچھی"

مرزا اسماعیل نے مرکزی حکومت سے گفتگو شروع کی تھی، جو پردۂ راز میں تھی۔ قاسم رضوی نے عزم آزادی کی حفاظت کرتے ہوئے مرزا اسماعیل کو آگاہ کیا:۔

"دوسری مبارکباد بھی قبول کیجئے کہ حیدرآباد کی آزادی کا آپ کو خیال ہے۔ لیکن اگر اس آزادی میں مرکزی قومی حکومت کا طوقِ غلامی نیگو شیئے ٹنگ کمیٹی (Negotiating Committee) کے ذریعہ اپنے گلے میں ڈال لینا شامل ہے تو اس سے انگریز کا طوقِ زرّیں کیا بُرا ہے؟"

مرزا کی مزید تباہ کاریوں کا حال قاسم رضوی ہی سے سنئیے:۔

"آپ کا (مرزا اسماعیل سے مخاطب ہو کر) وعدہ یاد دلاؤں۔۔۔ ہماری صبح اُمید نمودار ہونے میں کتنا زمانہ باقی ہے؟۔۔۔ مدارس وسطانی و تحتانی سے میتِ اردو کا اُٹھایا جانا، بھو کی انجمن ترقیِ اُردو سے روٹی کا چھین لیا جانا، بکری کے بچے پر الزام لگانے کے لئے بھیڑیے کو جج بنانا۔ ہماری گرفتاری کے لئے باہر سے صیادوں کو بُلانا، جاگیرداروں کو جو زیادہ تر مسلمان ہیں مبتلائے پریشانی کر دینا۔۔۔ اگر یہ اُمید کی شعاعیں ہیں تو ہم ابھی انتظار کرنے کو آمادہ ہیں کہ:۔

"ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مرنہ جاتے اگر اعتبار ہوتا"

دورِ مجہول

قاسم رضوی کی اس تقریر کے بعد مرزا اسماعیل سخت ذلیل خوار ہوا۔ اس کے خلاف ایک مستقل مہم شروع ہوئی اور رسوائے زمانہ ہوکر اُسے دکن کو خیرباد کہنا پڑا ـــــ لیکن شومیِ قسمت نے اگست ۱۹۴۷ء سے کچھ عرصہ قبل نواب چھتاری کو پھر مسلمانانِ دکن کے سر پر مسلط کردیا اور قاسم رضوی کے الفاظ میں

"پھر دورِ مجہول آیا اور پھر دکن کی بربادی کے بادل دلی اور حیدرآباد کے درمیان اُڑنے لگے۔" (خطبہ صدارت بابتہ ۱۹۴۷ء)

پہلا حملہ

اس اثنا میں کانگریس نے ریاستوں کے خلاف اعصابی جنگ (War of Nerves) شروع کردی۔ آتش فشاں پہاڑ پھوٹ پڑے اور ارضِ ہند میں زلزلہ آگیا۔ متعدد ریاستوں کے حواس جاتے رہے اور حیدرآباد کے شاہی محل میں بھی زلزلے کے جھٹکے محسوس کیے گئے ـــــ نہیں محسوس نہیں کیے گئے بلکہ محسوس کرائے گئے! ـــــ اور چھتاری نے کانگریسی اربابِ اقتدار سے گفتگو کا سلسلہ آغاز کرنا چاہا طے ہوا کہ ایک وفد جو چھتاری۔ عبدالرحیم۔ علی[1] یاور جنگ، اور نپگل دنکیٹ

[1] حیدرآباد کے خلاف آخری سازش میں ان کا بھی ہاتھ تھا۔ تقسیم ہند کے بعد انھیں اپنے عہدہ سے مستعفی ہونا پڑا تھا۔ حکومت ہند نے انھیں جامعہ عثمانیہ کا وائس چانسلر بنادیا ہے۔

راما راؤ کی پر مشتمل ہو شرائط مفاہمت آرٹیکل آف ایسوسی ایشن (Article of Association) کی شکل میں دہلی لے جائے۔ وفد کی روانگی کی تاریخ مقرر ہوئی۔ وفد کے عوامی اراکین ٹرین میں سوار ہوئے اور دہلی پہنچ گئے۔ لیکن علی یاور جنگ نے نہایت چالاکی اور خوبصورتی سے اس آرٹیکل کی شرائط اور اُس کے مضمون سے اُنھیں لاعلم رکھا! نواب چھتاری تو اس کو راز ہی راز میں پنڈت جی کے حوالے کرنا چاہتا تھا لیکن نظام نے حکم دیا تھا کہ کانگریسی اربابِ اقتدار کے سامنے اس دستاویز کو رکھنے سے قبل قائدِ اعظم کا مشورہ حاصل کرلیا جائے چنانچہ مجبوراً نواب چھتاری نے قائدِ اعظم سے اُن کی قیام گاہ پر ملاقات کی۔ قائدِ اعظم اس دستاویز کے مرتب کرنے والوں کی عقل و دانش پر حیرت زدہ ہوگئے۔ —— نواب چھتاری اور علی یاور جنگ کی گوشمالی کی گئی اور دستاویز رد کردی گئی!

یہ دستاویز کیا تھی؛ دراصل خوبصورت الفاظ کے پردہ میں انڈیا یونین میں شرکت کا راضی نامہ اور آزادیِ دکن کا قتل نامہ تھا۔ اس اثناء میں قاسم رضوی اور اکرام اللہ بھی دہلی پہونچ گئے۔ قائدِ اعظم نے انھیں ضروری ہدایات دیں جن کے متعلق نظام سے تبادلۂ خیال کے لئے اکرام اللہ حیدرآباد گئے، اور لوٹ کر نظام کے تاثرات سے قاسم رضوی اور اراکینِ وفد کو آگاہ کیا —— اور اس طرح آزادیِ دکن پر نواب چھتاری کا پہلا وار خالی چلا گیا!

باب ہفتم

موت اور حیات کی کشمکش

۱۵۔ اگست ۱۹۴۷ء کی رات برطانیہ کے نمائندہ[1] کو اُس
جشنِ آزادی کے اقتدار اعلیٰ کے ساتھ خدا حافظ کہدیا گیا، اور
حیدر آباد کے طول و عرض میں جشنِ آزادی بڑی دھوم دھام سے
منایا گیا —— ہندوستان بھی آزاد ہوا۔ لیکن کمینہ غلام اپنے
ساتھی کی آزادی پر کبھی خوش نہیں ہوتا۔ اس کو پاکستان کے قیام
اور دکن کی آزادی کا داغ تھا۔ اُس نے اپنی آزادی کی خوشیاں تو
منائیں، لیکن اپنے ساتھیوں کی خوشیوں کو خاک میں ملانے کی
ممکنہ تدبیریں بھی اختیار کیں اور ان کی تباہی کے سامان مہیا کئے۔
دلّی کے دربار میں شادیانے بجائے گئے، گل و گلال اُچھالے گئے
اور —— اسلامیانِ ہند کو خون میں نہلایا گیا۔ مشرقی پنجاب، دہلی اور
دیگر بے شمار مقامات پر بے کس و بے بس مسلمانوں کا قتل عام شروع

---

[1] انگریز ریزیڈنٹ جو حیدر آباد میں مقیم رہتا تھا۔

ہوا۔ اور نتیجتاً مہاجرین کا سیلاب دکن اور پاکستان کی طرف رواں ہوگیا۔ اور شادمانی کی بجائے بے گور دکفن نعشوں کے لئے قبریں کھودنے پر پاکستان کو مجبور کر دیا گیا ——!

رضاکار تحریک کی ابتدا

اور پھر سلطنت حیدرآباد کی سرحدوں پر سیوک سنگھیوں اور فوجیوں کے بے شمار کیمپ قائم کئے گئے، جہاں سے ہمارے سرحدی مواضعات کے غریب اور نہتے مسلمانوں پر پے در پے حملے شروع ہوئے اُنھیں قتل اور اُن کے مکانات کو نذرِ آتش کیا جانے لگا، اُن کی عورتوں کو لونڈی اور بچوں کو غلام بنایا جانے لگا —— اِن واقعات نے ہمارے عزمِ آزادی کو اور بھی مستحکم کیا اور دکن کا ایک ایک مسلمان اپنے آباؤ اجداد کی امانت کی حفاظت کے لئے رضاکارانہ طور پر سپاہی بن گیا۔

دوسرا حملہ

حیدرآباد سے تعلقات کا انقطاع دراصل شمالی ہند سے جنوبی ہند کے عملاً انقطاع[۱] کے مترادف تھا اور انڈیا یونین اپنے منتشر وسائل کے مدنظر حیدرآباد کو طاقت سے مجبور کرنے کے موقف میں نہیں تھا، اس لئے سردار پٹیل نے نواب چھتاری اور سر سلطان اور مونٹ بیٹن نے اپنے دوست مانکٹن[۲] کے ذریعے

---

[۱] بمبئی پریسیڈنسی کو مدراس پریسیڈنسی اور میسور سے ملانے والی تمام ریلیں ریاست حیدرآباد ہی سے گزرتی ہیں۔

[۲] مانکٹن حیدرآباد کا مشیر دستوری تھا۔

نظام کو جال میں پھانس لینے کی جد و جہد شروع کی ــــــ نظام کو ڈرایا اور دھمکایا گیا، اور سبز باغ بھی دکھائے گئے، یہاں تک کہ معاہدۂ مفاہمت پر دستخط کرنے اور اس کو سر سلطان، مانکٹن اور چھتاری کے ذریعہ نئی دلّی روانہ کرنے پر وہ آمادہ ہو گیا۔ اس ساری کارروائی کو انتہائی راز میں رکھا گیا، کیونکہ چھتاری جانتا تھا کہ دکن کا مسلمان اس معاہدہ پر جو درحقیقت الفاظ کے اُلٹ پھیر کے ساتھ دستاویز شرکت (Instrument of Accession) تھا، کبھی راضی نہیں ہو سکتا ــــــ

طیارہ صبح کاذب کو دلّی روانہ ہونے والا تھا، اس میں پٹرول ڈال دیا گیا تھا اور جملہ انتظامات پر اسرار طریقہ سے مکمّل ہو چکے تھے کہ اس کی اطلاع رات کے دو بجے آگ کی طرح شہر میں پھیل گئی۔ مسلمان جوق در جوق طیران گاہ کی طرف روانہ ہوئے ــــــ وفد کو روک لیا گیا۔ مسلمانوں کے عزم سے ناپاک ارادوں کا طیارہ ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا، اور انسانی سروں کے موجیں مارتے ہوئے سمندر میں غرق ہو گیا! ــــــ آزادیِ دکن پر چھتاری کے دوسرے حملے کو بھی منشائے ایزدی نے ناکام کر دیا!!

معاہدۂ انتظامِ جاریہ

اس وفد کی بجائے دوسرا وفد جو نواب معین نواز جنگ - عبدالرحیم - اور پنگل وینکٹ راما ریڈی پر مشتمل تھا دہلی روانہ کیا گیا - سر سلطان نے اس وفد کی راہ میں ممکنہ مشکلات پیدا کیں ــــــ دہلی میں اراکینِ وفد سے اُن کی تعلیمی خصوصیات

خوبیاں (Qualifications) دریافت کی گئیں اور اُن کا مذاق اُڑایا گیا
جس کی وجہ سے گفتگوئے مفاہمت آگے نہیں بڑھ سکی، اور جب تعطل
کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تو ایک ایسے دَور میں جبکہ دہلی مسلمانوں کے
خون سے رنگین تھی، سردار پٹیل نے قاسم رضوی کو وہاں آنے کی
دعوت دی، جو قبول کر لی گئی — پٹیل کو اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ تھا،
غیر کو مرعوب کرنے کے فن پر اعتماد اور اپنی آہنی گرفت پر اعتبار تھا۔ وہ
سمجھتا تھا کہ پست قامت، دبلے پتلے انسان کو انڈیا یونین کی دیوہیکل
حکومت کے طمطراق اور رعب وداب سے مرعوب کر لے گا اور آزادیٔ دکن
کے قتل نامہ پر دستخط کرنے کے لئے اس کو مجبور کر دے گا — لیکن
اُس کو معلوم نہ تھا کہ پست قامت انسان پست ہمت نہیں ہے، اور
دُبلے پتلے انسان کے کمزور سینے میں نرم ونازک گوشت کا نہیں بلکہ
فولاد کا دل ہے! — گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ پٹیل کا ہر داؤ ناکام
ہر وار خالی گیا، اور برہمنی عیاریوں کو شکست ہوتی چلی گئی! —
بالآخر پٹیل نے جھنجھلا کر کہا:۔

"تو پھر مسٹر رضوی جنوبی ہند میں ایک جنگ ہوگی خوفناک"

"اور آپ مجھے محاذِ جنگ پر پائیں گے، مسٹر پٹیل!"

لہ مسلمانوں نے اُنھیں منع کیا مگر اُنھوں نے کہا، ملت کی خدمت میں موت کا کوئی خوف حائل نہیں ہو سکتا — اُن کے دہلی جانے کے بعد مسلمانوں نے روزے رکھے اور اُن کی واپسی تک دعائیں کرتے رہے۔

قاسم رضوی نے جواب دیا

اس کے بعد مسٹر گاندھی سے قاسم رضوی کی ملاقات ہوئی۔ مسٹر گاندھی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا:۔

"سید صاحب! انسانیت کو بچائیے، آپ ہی دکن کے طاقتور انسان ہیں، اور مجھے امید ہے کہ آپ شمالی ہند کے واقعات کو دکن میں رونما نہیں ہونے دیں گے۔"

قاسم رضوی نے انھیں تفصیلات سے آگاہ کیا اور کہا کہ:۔

"مسٹر گاندھی۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ خود ہمارے حالات کا مشاہدہ کریں۔ آپ نہیں آسکتے، تو مس امرت کنور یہاں موجود ہیں۔ انھیں میرے ساتھ دکن بھیجئے، یہ اپنی آنکھوں سے ہندوؤں کی حالت دیکھ سکیں گی، اور اُن اطلاعات کی تحقیق بھی کر لیں گی جو بھیانک شکل میں آپ تک پہونچائی جارہی ہیں ——— انھیں یقین ہوجائیگا کہ دکن کی مقدس سرزمین پر انسانی خون کی بے حرمتی نہیں کی گئی۔"

رات کو انڈیا یونین کی کابینہ کا اجلاس منعقد ہوا لیکن کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ اس لئے دوسرے روز ——— ۲۹۔ نومبر ۱۹۴۷ء کو معاہدۂ انتظام جاریہ پر دستخط کر دیئے گئے! مردِ مومن کی سیاست برہمنی دھڑابندیوں پر غالب آگئی ——— !!

شرائطِ معاہدہ: اس معاہدہ کے اہم نکات درج ذیل ہیں:۔

(۱) حیدرآباد انڈیا یونین میں شریک نہیں ہوگا
(۲) وہ تمام انتظامات (معاشی اور رسل و رسائل کی بابتہ) برقرار رہیں گے جو ۱۵۔اگست سے قبل قائم تھے۔
(۳) حیدرآباد کو حق حاصل ہوگا کہ دنیا کے دیگر ممالک میں اپنے ایجنٹ جنرل مقرر کرے۔
(۴) انڈیا یونین کی کوئی فوج حیدرآباد میں مقیم نہیں رہے گی۔
(۵) حیدرآباد کی فوج کے لئے انڈیا یونین مقررہ اسلحہ فراہم کرتا رہیگا۔
(۶) اختلافات کی صورت میں ثالثی فیصلہ حاصل کیا جائے گا۔
(۷) معاہدہ ایک سال تک نافذ رہیگا اور اس اثنا میں مستقل معاہدہ کے لئے گفت و شنید جاری رہے گی۔

قاسم رضوی حیدرآباد لوٹ آئے ــــ مظفر و منصور!

ظفرمندی

ان کی اس ظفرمندی سے پرستاران حریت کے حوصلے بڑھے اور آزادیِ دکن کا تصور مادی شکل میں دنیا کے سامنے آیا ــــ لیکن قاسم رضوی کی عدم موجودگی میں مخالفین نے کچھ غلط فہمیاں پیدا کرنے کی سعی کی تھی۔ یہ پروپیگنڈا کیا گیا تھا کہ قاسم رضوی پٹیل سے مل گئے ہیں اور یونین میں شرکت کے لئے راضی ہوگئے ہیں۔ عوام کو صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے لئے ۷۔ڈسمبر ۱۹۴۷ء کو دارالسلام میں ایک جلسۂ عام منعقد کیا گیا۔ قاسم رضوی نے کلام پاک کے سورۂ قُل اعوذ برب الناس سے تقریر کی ابتدا کی اور دعا مانگی کہ تبارک تعالے

مسلمانوں کو وسوسوں سے محفوظ رکھے! پھر اُنھوں نے سیاسی اور دستوری حالات کی وضاحت کی اور بتایا کہ حیدرآباد کی انڈیا یونین میں شرکت کے سوا کسی اور شرط پر سردار پٹیل مفاہمت کے لئے راضی نہیں تھے لیکن معاہدۂ انتظام جاریہ حریت کی فتح اور پٹیل کی ضد اور ہٹ دھرمی کی ایک بیّن شکست ہے۔

"مجھ سے پوچھا گیا کہ حیدرآباد میں ایک لاکھ رضاکار کیوں ہیں؟ میرا جواب یہ تھا کہ ایک لاکھ اس لئے ہیں کہ ابھی تک دو لاکھ نہیں ہو سکے!"

"بعض اشخاص جانتے بوجھتے دریافت کرتے ہیں کہ دبتا ہوا معاہدہ کیوں کیا گیا —— میں اُن سے پوچھتا ہوں کہ اس کی متبادل صورت کیا ہے —— ہم نے اپنے حالات کا جائزہ لیا اور حقیقت پسندانہ انداز میں دبتا ہوا معاہدہ کیا کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کی کمزوریوں سے اغیار ناواقف ہیں؟ اگر ایسا ہے تو آپ غلطی پر ہیں۔ غور سے سنیئے۔ انھیں معلوم ہے کہ آپ کے ہاں کتنے کارتوس اور کارتوس کے خول کتنے ہیں۔ منبکن کے زمانہ کی بھرمار بندوقیں کتنی ہیں، کتنی چالو حالت میں اور کتنی زنگ آلود ہو گئی ہیں —— اور آپ کی سب سے بڑی[1] کمزوری سے بھی وہ واقف ہیں۔

---

[1] دربار کی ناگفتہ بہ حالات

——میں اس کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا، لیکن——

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد

وگردم درکشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد"

قاسم رضوی نے بتایا کہ یہی کمزوری ذی عزت معاہدہ کی راہ میں حائل ہوتی رہی۔ اور پھر عوام سے پوچھا کہ اِن ساری کمزوریوں کے باوجود کوئی معاہدہ آزادی کی اساس پر کیا جائے تو اس کو ہماری فتح تصوّر کیا جائے یا شکست۔

"بعض اشخاص کہتے ہیں کہ اس معاہدہ سے انڈیا نے وقت حاصل کیا ہے۔ وہ دن بدن طاقتور ہوتا جائے گا، اور حیدرآباد کے لئے خطرناک صورت اختیار کرے گا۔ لیکن میں یہ کیوں نہ سوچوں کہ اس سے ہمیں وقت ملا ہے۔ میں یہ کیوں نہ سمجھوں کہ اپنے سیاسی انتشار، نسلی و مذہبی اختلاف اور بین المملکتی اور بین الاقوامی صورتِ حال کے مدنظر انڈیا کمزور سے کمزور تر ہوتا جائے گا۔ اور اس کے برعکس ہمارے متحدہ عزم سے حیدرآباد دن بدن طاقت حاصل کرتا اور پھولتا و پھلتا جائیگا۔ —— بیچارے معترضین کو اُس طرح سوچنا مبارک اور مجھے اس طرح سوچنا مبارک .... اسلحہ؟ اسلحہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ لیکن یقین کیجئے کہ اگر آپ کو اپنی ذات پر بھروسہ اور مقصد کی سچائی پر اعتماد ہے تو زمین اسلحہ اُگلے گی۔ آسمان

اسلحہ برسانے لگیں گے"۔

آخر میں انھوں نے کہا کہ ساری خرابی کا باعث ہماری بد دیانت، دقیانوسی، خود غرض اور سازشی وزارت ہے، جو در اصل ہمارا اندرونی اور مہلک مرض ہے، اور جس کے علاج کے بغیر بہتری کی توقع عبث ہے۔ اُنھوں نے اعلان کیا کہ اب اُن کی ساری توانائیاں کابینہ کی تشکیلِ جدید پر صرف ہوں گی ـــــ مردہ رگوں میں تازہ خون دوڑا کر مریض کو حیات نو بخشی جائے گی! ـــــ

قاسم رضوی کی مشکلات

شخصیت کی رفعت اور کردار کی بلندی در اصل ثابت قدمی اور دانشمندی سے اپنی مشکلات کے مقابلہ کی صلاحیت میں مضمر ہوتی ہے۔ اگر غیر جانبدار مؤرخ کو اُن مشکلات کا علم ہوسکے جو مسلمانانِ دکن کو درپیش تھیں اور اس مخلصانہ کشمکش اور مجاہدانہ جد و جہد کا صحیح اندازہ ہوسکے، جو ان مشکلات کو رفع کرنے کے لئے قاسم رضوی نے کی تو مجھے یقین ہے کہ اُن کا نام تاریخ ہند کے مجاہدین کی فہرست کا عنوان ہو جائے گا، اور ابد تک حریت کی فتح اور انسانی عظمت کا نشان بنا رہے گا! ـــــ اُس وقت جبکہ ایک سرگشتہ و پریشان قوم نے مجلس کی صدارت قاسم رضوی کے حوالے کی مملکت حیدر آباد کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ حکومت کا "مرا ہوا ڈھانچہ" تھا جو قاسم رضوی کے سامنے تھا۔

"دکن کا موقف کمزور ہو چکا تھا، حسنِ انتظام کی کمی اور تدبر کے دیوالیہ نے انگریز کا تسلط قائم کر دیا تھا۔۔۔۔۔۔ حیدر آباد کی حدود کی حفاظت نہیں کی گئی۔ سرحدیں سکڑتی گئیں۔۔۔۔۔۔۔۔ پہلے انگریز شاہِ دکن کی قدم بوسی کا آرزو مند تھا اور اب بادشاہ دکن ریزیڈنسی[1] کا محتاج ہو گیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ نمکخوارانِ خاندانِ آصفی نے رعایا کو لوٹا، اور حصولِ مدارج کے لئے انگریز کی خوشامد اور بادشاہِ وقت کے خلاف شہادتوں کی فراہمی کو اپنا شعار بنایا! ــــ اور وزرائے وقت کی اس نمک حرامی اور غداری کا صلہ خطابات کے ذریعے دیا گیا! ــــ پھر چھتاری کی مجہول حکومت کا آغاز ہوا۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ دورانِ جنگ تھا۔ اگر کوئی دیانت دار کارگزار ہوتا تو اس دَور میں حیدر آباد کے کھوئے ہوئے مقام کو واپس، سکڑی ہوئی حدود کو وسعت پذیر کر دیتا اور دکن سے سمندر کی لہروں کو ٹکراتا ــــ چھتاری نے انگریز کو سب کچھ دیا اور اُس سے کچھ نہ لیا۔۔۔۔۔ ۔۔۔جنگ کی بیدریغ بخته سامانی اور اسلحہ کی بے حساب فراوانی! چھتاری نے طاؤس ورباب اور گیند و بلہ کی بجائے تیغ و تفنگ سے کھیلا ہوتا تو آج مسلمان حراسان و پریشان نہ ہوتا بلکہ سپاہی تو سپاہی دکن کا بچہ بچہ بھی عصری آلاتِ حرب سے مسلح ہوتا۔۔۔۔۔۔۔۔

---

[1] بلحاظ معاہدات حیدر آباد میں ایک ریزیڈنٹ برطانوی حکومت کی جانب سے متعین رہتا تھا۔

لیکن آج ہماری حالتِ زار کو دیکھیے کہ اپنی حفاظت کے لئے
ٹینک اور توپ تو کجا خودکشی کو چھری بھی نہیں ہے۔ سب
سے آخر مرزا اسماعیل نے آکر فرنیش حکومت کو مرحوم کر دیا۔
ہمارے اقتدار کو موت کے گھاٹ اُتار دیا اور تابوت میں رکھکر
برہمن کے اقتدار کا آخری کیلا ٹھونکنا چاہتا تھا کہ قدرت
نے اُس کو اُس کے مغز میں ٹھونک دیا۔ اور وہ برین گن فیکٹری
کو ہندوستان کے حق میں منتقل ہونے دے کر ملت فروشی
کا بدنما داغ لے کر دکن بدر ہوا —— اور پھر دورِ مجہول
(نواب چھتاری کا دَور) آیا۔ اور پھر دکن کی بربادی کے بادل
دلّی اور حیدرآباد کے درمیان اُڑنے لگے۔"

(ماخوذ از خطبۂ صدارت اجلاسِ سالانہ مجلس اتحاد المسلمین منعقدہ ۴۸ء)

نیز حکومت کی فرسودہ مشینری جو رشوت ستانی سے زنگ آلود تھی
قوم و ملک کے لئے خطرناک صورت اختیار کر چکی تھی۔ ایک طرف کانگریسی
سرمایہ داروں کے لئے عہدہ داروں کو خرید لینا اور اُن کا منہ بند کر کے
باغیانہ تحریکات کا پھیلانا بہت آسان تھا اور دوسری طرف رشوت
کی گرم بازاری سے عوام میں حکومت کے خلاف نفرت کے جذبات عام
ہو رہے تھے —— غیر صالح بندے زمین کی وراثت کے کس طرح دعویدار
ہو سکتے تھے؟ اسی خطرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قاسم رضوی نے
کہا تھا:-

"لیکن اس وقت راشی عہدہ داروں کی اصلاح کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ اپنے پہلے خطبۂ صدارت (بابتہ ۱۹۴۷ء) میں حکومت کو میں نے بتایا تھا کہ یہی طبقہ ملک کا سب سے بڑا دشمن ہے اور یہی تباہی کا باعث ہوگا، اور میری پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی....... موجودہ خرابیوں کی بڑی ذمہ داری راشی عہدہ داروں ہی پر ہے۔ اب بھی وقت نہیں گیا۔ موجودہ حکومت متوجہ ہو اور راشیوں کے لئے ایسی سزا تجویز کرے جو قتلِ انسانی سے زیادہ سخت ہو۔ اور اس سزا میں سزائے تازیانہ ضرور شامل رہے.........
بہرحال اس کا قلع قمع نہ ہوا تو یہ حکومت ہاتھ سے گئی! ـــ نہ ملک باقی رہے گا اور نہ مالک، نہ آقا اور نہ نوکر!
.... ذمہ دار ملازمین کا سابقہ ریکارڈ اور اُن کی غداری قوم کے سامنے ہے جس نے گھُن کی طرح نقصان پہنچایا۔ مملکت کو کمزور سے کمزورتر کر دیا....... سرکاری ملازمت کیا تھی عیش تھا، لہو و لعب تھا، نہ قوم و ملک کا درد تھا نہ انصرامِ حکومت کا خیال۔"

(خطبۂ صدارت بابتہ ۱۹۴۸ء)

قاسم رضوی کے لئے دوسرا محاذ وہ تھا جہاں عثمان علی خاں کی درباری سازشیں جاری تھیں، اور مخصوص امرار کے خاندان عوامی رجحانات کے مقابلہ

میں ذاتی مفاد کی حفاظت اور اجارہ داری کی بقار کے لئے توڑ جوڑ میں مصروف اور عوام کی تنظیم اور عسکری ترقی میں حائل ہو رہے تھے ــــ

تیسرے محاذ پر اسٹیٹ کانگریس، آریہ سماج اور مہاسبھا متحدہ طور پر نبرد آزمائی کر رہے تھے، اور اُن کے تربیت یافتہ رضاکار حیدر آباد کی طویل سرحدوں پر قتل و غارت گری میں مصروف تھے ــــ

چوتھا محاذ دیہات اور قصبات کا تھا، جہاں برہمن، پٹیل و پٹواریوں کی حکومت اپنی مخصوص روایات، موروثی خدمات اور صدیوں کے اثر و نفوذ کو استعمال کر کے آزادی کی تحریک کو آگے بڑھنے سے روک رہے تھے ــــ

پانچواں محاذ وہ تھا جہاں اقلیت اور اکثریت کی دستوری جنگ ہو رہی تھی۔ مسلمان اقلیت میں تھے، اور آزادیِ دکن کی حمایت میں دستوری اکثریت کو معرضِ وجود میں لانے کی بڑی بھاری ذمہ داری قاسم رضوی پر تھی ــــ

چھٹے محاذ ــــ جس کو دراصل پہلا محاذ کہنا چاہیئے ــــ پر مسلمانوں کے اندرونی خودغرض، مرکز گریز عناصر برسرِ پیکار تھے، جو دولت کی طمع، یا چھوٹے اقتدار کی لالچ میں مسلمانوں کی مرکزیت کو صدمہ پہنچانے کی بار بار کوشش کر رہے تھے ــــ

اور سب سے بڑا محاذ مسلح اور طاقتور انڈیا یونین کا تھا جو اپنے سارے وسائل ــــ ریڈیو۔ اخبارات۔ ماؤنٹ بیٹن کے شخصی اثرات، معاشی

ناکہ بندی - سیوک سنگھ کے غنڈوں - تربیت یافتہ فوجیوں، اور سرحدی حملوں اور فوج کشی کی دھمکیوں ــــ کو قاسم رضوی کے مقابلہ میں استعمال کر رہا تھا، اور جس کی آزمودہ و تجربہ کار فوج کا ایک کالم[1] پہلے ہی سے قلبِ دکن میں موجود تھا ــــ!

آہنی عزم

اور ان ساری کمزوریوں کے ساتھ طویل کٹی پھٹی سرحدوں والے حیدرآباد کے "جزیرہ" کی آزادی کے تحفظ کے لئے حیدرآباد کے پاس صرف چند ہزار سپاہی تھے ــــ نہتے اور غیر مسلح! اور ان ساری مشکلات کے مقابلہ پر منشائے ایزدی نے ایک دُبلے پتلے انسان کو لاکھڑا کیا تھا! ــــ لیکن اُس کی فکر میں جوہری توانائی تھی اور آنکھوں میں شعاعِ آفتاب! مشکلات ہمت شکن تھیں، لیکن شاہین کے تجسس اور چیتے کے جگر کے لئے کوئی مشکل نہیں تھی جو آسان نہ ہو سکے!! ــــ قاسم رضوی کی جرأتِ کردار نے اِن ساری ذمہ داریوں کو قبول کیا۔ اور اُن کے تدبّر نے بیرونی مقاومتوں کے لئے اندرونی استحکام کو ضروری سمجھا، کیونکہ درونِ خانہ معاملات کی گتھیوں میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ اور رہگزرِ یہ کشمکش کے لئے اُن کے دلِ بے قرار کو فرصت نہیں مل رہی تھی - چنانچہ جدوجہد کی منزلِ اول میں اُنھوں نے مجلس[2] کی صفوں

---

[1] انڈیا یونین کے حصہ میں آئی ہوئی بہت بڑی فوج ۱۵- اگست ۱۹۴۷ء کے بعد بھی حیدرآباد میں موجود تھی، جو معاہدۂ انتظامِ جاریہ کی رو سے ریاست سے بلالی گئی۔

[2] اس سلسلہ کا ایک واقعہ ہے کہ مجلس کے اجلاس سالانہ بابتہ ۴۷ء میں ایک تحریک

کو پنجۂ آہنی سے استوار کیا اور قوم سے اُس کے اعتماد کی توثیق کرائی۔ اور جب معاہدۂ انتظام جاریہ پر دلّی میں دستخط ہو گئے تو شر پسندوں کی کمر ٹوٹ گئی، اور مرکز گریز عناصر پر بجلی گر گئی! —— تحریک آزادی کے لئے زمین استوار ہوئی اور دیگر مسائل کی طرف قاسم رضوی کی توجہ منعطف ہو سکی!

قلندرانہ طریق

دہلی سے واپسی پر قاسم رضوی نے عوام کو آگاہ کیا تھا کہ حیدر آباد کی سب سے بڑی کمزوری اُس کی خود غرض اور سازشی وزارت ہے، اور اعلان کیا تھا کہ جسدِ سیاسی کے اس بہتے ہوئے ناسور کا جلد سے جلد علاج کیا جائے گا۔ اس اعلان سے ایک طرف شاہ منزل میں ہل چل پیدا ہوئی تو دوسری طرف شاہی محل میں آگ لگ گئی! خود بیں و خود غرض نظام اپنی شخصی حکومت میں عوامی مداخلت کس طرح گوارا کر سکتا تھا؟ اور اپنے مقرر کردہ شاہ پرستوں اور جی حضوریوں کی جگہ حق پرستوں اور ترقی پسندوں کو کس طرح برداشت کر سکتا تھا؟ —— اُس نے قاسم رضوی کو شاہانہ رعب و داب سے متاثر کرنا چاہا اور اپنے ایک مکتوب

(حاشیۂ صفحۂ گذشتہ) پیش کی گئی کہ مجلس میں (Forward Block) قائم کرنے کی اجازت دی جائے۔ قاسم رضوی نے اس کی سخت مخالفت کی، اور اس کو اختلاف و انتشار کا باعث قرار دے کر کہا کہ اسلام میں کوئی Forward Block یا کوئی (Backward Block) موجود نہیں ہے۔ اغیار تو فطرتاً اور مذہباً مختلف ہونے کے باوجود متحد ہو رہے ہیں اور آپ فطرتاً اور مذہباً متحد ہو کر مختلف ہونا چاہتے ہیں —— محرک کچھ کہنا چاہتا تھا کہ مجمع نے "بیٹھ جاؤ" "بیٹھ جاؤ" سے آسمان کو سر پہ اُٹھا لیا اور محرک کی آواز نقار خانہ میں طوطی کی آواز ہو کے رہ گئی!

میں لکھا کہ جو قدم تم نے اُٹھایا ہے میں اُس کو ناپسند کرتا ہوں۔ اور ہدایت کرتا ہوں کہ تم اس سے باز آؤ ورنہ سخت نقصان اُٹھاؤ گے!
لیکن قاسم رضوی پر اس ہدایت کا برعکس اثر ہوا۔ اُنھوں نے قلندرانہ بے باکی سے جواب دیا کہ میرے نزدیک انسانی خفگی کا کوئی تصوّر موجود نہیں ہے۔ میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور اُسی کی خفگی اور ناپسندیدگی سے گھبراتا ہوں۔ میں ایک فقیر ہوں اور مادّی و دنیوی نفع و نقصان کا کوئی تخیل میرے پاس نہیں ہے۔ میں اُس مقام پر خود کو پاتا ہوں جہاں مضرت اور منفعت کی قدریں بدل جاتی ہیں اور انسان زر و ضرر کی حدود سے بالاتر ہو جاتا ہے ــــ میں جو کچھ کر رہا ہوں اپنے خدا کی خوشنودی، قوم و ملک کے استحکام اور آپ کی بقاء کے لئے کر رہا ہوں اور اس کے لئے کوئی "نقصان" برداشت کرنا پڑے تو مجھے اس کی پرواہ نہ ہوگی۔[1]

یہ جواب نظام کی طبع نازک پر شاق گزرا۔ وہ تو ہمیشہ "خداوند" "سرکار" "مناسب" "شایانِ تعمیل" سننے کا عادی تھا اور کھرے کھرے اور تلخ جواب کا اُس کی زندگی میں یہ پہلا اتفاق تھا۔ وہ بہت برہم اور بہت چراغ پا ہوا اور خفگی کی حالت میں قاسم رضوی کو دھمکی دی کہ "تم مجلس اتحاد المسلمین کے صدر نہیں رہ سکوگے"۔ اس کا جواب قاسم رضوی نے صرف اس قدر دیا کہ:-

---

[1] ملاحظہ ہوں صفحات ۷۷، و ۷۸، تحت عنوان "ظفر مندی"

"آپ چاہیں تو میرے خلاف تحریک عدم اعتماد پیش کریں
یا آئندہ انتخابات میں مجھے ووٹ نہ دیں ——"

تدبر کا معجزہ مراسلت ایک عرصہ تک جاری رہی اور جب "حکیم السیاست"[لے] کا غم وغصہ کوئی اثر پیدا نہ کر سکا اور بادشاہی بلال وجبروت سے درویش خدامست مرعوب نہ ہو سکا تو درباریوں نے ایک طلسمی جال میں طائرک بلند بال کو گرفتار کرنے کی تجویز پیش کی!۔ قاسم رضوی سے خواہش کی گئی کہ عوامی ورزارا کا خیال ترک کر کے وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ قبول کریں۔ نظام نے بہ یک کرشمہ دو کار کے مصداق ایک طرف قاسم رضوی کو خرید لینا چاہا اور دوسری طرف ترقی پسند عوامی تحریک کو کمزور کرنا چاہا جو محض قاسم رضوی کی شخصی توجہات سے پروان چڑھتی جارہی تھی! —— لیکن غلط فہمی میں تھا بیچارہ نظام! اُسے کیا خبر تھی کہ شاہین کو سنہری تیلیوں میں بند نہیں کیا جا سکتا!! —— بہر حال اندرونی سیاست کی بساط پر کھیل جاری رہا۔ کچھ مہرے آگے بڑھے، کچھ پیچھے ہٹے اور بالآخر رجعت پسندی کو مات ہو گئی! چھتاری کو استعفا، دینا پڑا، اور اُس کی جگہ نظام کی خواہش پر میر لایق علیؒ نے جدید کابینہ ترتیب دی، جس میں چار مسلمان اور چار ہندو عوامی نمایندے شریک کر لئے گئے۔ اس

لے درباریوں نے نظام کو یہ خطاب دیا تھا۔

کابینہ میں مجلس کے نمائندوں کا انتخاب بہت مشکل امر تھا۔ کیونکہ تقسیم اقتدار کا یہی وہ مقام ہوتا ہے جہاں کسی سیاسی جماعت میں انتشار کے امکانات قوی ہو جاتے ہیں۔ مجلس شوریٰ نے اس بارے میں قاسم رضوی کو کامل اختیارات دیئے اور وہ چاہتے تو اپنی شخصی پسند کے اشخاص کو کابینہ میں بھیج دیتے، لیکن انھوں نے جمہوریت کی تحقیر کو گوارا نہیں کیا، بلکہ "شاورھم فی الامر" کے مطابق اس مسئلہ کو اپنی عاملہ کے سپرد کیا۔ جس نے اپنی آزادؔ مرضی سے یاسین زبیری ایڈوکیٹ، عبدالرؤف ایڈوکیٹ اور اکرام اللہ ایڈوکیٹ (صدر مجلس ضلع عثمان آباد) کو ان عہدہ ہائے جلیلہ کے لئے منتخب کیا۔ عبدالرحیم پہلے ہی سے منتخبہ تھے۔ ہندوؤں کی جانب سے ہیگل وینکٹ راما ریڈی کے علاوہ پنڈت راماچاری۔ مسٹر جوشی اور مسٹر ملکارجن اپا ایڈوکیٹ کو کابینہ میں شامل کیا گیا —— نگاہِ مردِ مومن سے ارضِ دکن کی تقدیر بدل گئی۔ قوت ارادی سے عددیت کے تمام مورچے ٹوٹ گئے اور تاریخِ دکن میں پہلی مرتبہ عوامی وزراء کی اکثریت سے کابینہ تشکیل دی گئی! ساری کمزوریوں اور مشکلات کے باوجود تین مہینے کے قلیل عرصے میں ایک قدیم اور مضبوط حکومت کو بغیر کسی جبر و تشدد اور خونریزی کے قاسم رضوی کے تدبر نے بدل دیا!!

ے دوستی اور اعتماد کے سبب سے قاسم رضوی کا رجحان فطرتاً اکرام اللہ کی طرف تھا۔ لیکن اس امر سے کہ مجلس میں سب سے کم ووٹ اک [illegible] قاسم رضوی کی جمہوریت پسندی پر روشنی پڑتی ہے۔

—— یہ تدبّر کا معجزہ نہیں تو اور کیا ہے !! ——

سرحدی ہنگامے معاہدۂ انتظام جاریہ کی روشنائی ابھی خشک بھی نہ ہونے پائی تھی کہ انڈیا یونین نے اس کی خلاف ورزی شروع کردی۔ جوناگڈھ، ریاستہائے اڑلیسہ وغیرہ میں اُس کے جابرانہ اقدام کی کامیابی سے اُس کو توقع تھی کہ حیدرآباد پر بھی آسانی سے قبضہ ہوسکے گا اور اُس کو یقین تھا کہ ایک سال کے عرصہ میں اُس کے کارندوں کی تخریبی کارروائیوں اور تباہ کاریوں سے ایسا خلفشار پیدا کیا جاسکے گا کہ جس سے حیدرآباد کا آزاد رہنا محال ہوجائے گا۔ اسٹیٹ کانگریس کے ایک لیڈر رام چندر راؤ نے حیدرآباد کی شکست کے بعد انہی کارگذاریوں کا اس طرح اعتراف کیا:۔

> "جدوجہد کے دورِ اول میں ہم نے ۹ ہزار رضاکار حیدرآباد بھیجے، تاکہ جرائم کا ارتکاب کرکے جیل چلے جائیں، اور پھر ہم نے اپنی کشمکش کا رُخ کروڑگیری (کسٹمس) کے اُن ناکوں کو تباہ کرنے کی طرف پھیر دیا جو حیدرآباد کی طویل سرحدوں پر واقع تھے۔ پندرہ سو میل لمبی سرحد پر سات سو پچاس ناکے تھے جن میں سے پانچسو کو ہم نے منہدم کردیا اور بالآخر ہم نے خونریز جبر و تشدد سے رسل و رسائل کو

منقطع اور آبادیوں کو دہشت زدہ کرنا شروع کیا۔ اس غرض کے لئے ہم نے ہزاروں کیڈٹس کو تربیت دی اور سرحدی مسلح کمپیوں کو اسلحہ فراہم کیا (سر ظفراللہ کی تقریر جورامچندر راؤ کے حوالے سے انھوں نے ۲۴-مئی ۱۹۴۹ء کو سلامتی کونسل میں کی)

قاسم رضوی کے الفاظ میں :-

"ہم نے برطانوی اقتدار کو رودِ موسیٰ میں ڈبو دیا اور اپنی آزاد مرضی سے دورانِ معاہدہ کے لئے چند پابندیاں عائد کرلیں۔ لیکن ہندوستان کا دیو حیدرآباد کو زندہ نگلنا چاہتا تھا اُس نے تسلیم کردہ حیدرآباد کی آزادی سے انکار شروع کردیا "خوئے بدرا بہانۂ بسیار" کے مصداق ہم پہ الزام تراشی شروع کی۔ ہماری سرحدوں پہ کشت وخون کا بازار گرم کیا۔ — ہماری آبادیوں کو جلایا گیا اور بھیڑیے کی طرح پانی گندہ کرنے کا الزام، بکری کے بچہ پہ عائد کیا جانے لگا ...... کمیونسٹوں کو ہماری سلطنت کے اطراف اڈے بنانے کا اختیار دیا گیا، انھیں اسلحہ فراہم کیا گیا اور اُن سے امن سوزی کرائی گئی — لیکن جادو خود اُن کے سر پہ چڑھکر بولنے لگا اور جب دوسرے کے لئے کھودا ہوا کنواں خود اُن کے سامنے آیا تو حیدرآباد پہ الزام لگایا گیا کہ

کمیونسٹوں پر سے پابندی اُٹھا کر ہندوستان کے لئے خطرہ پیدا کیا گیا ہے! اور پھر کمیونسٹوں کے مقابلہ کے لئے غنڈوں اور اشرار کو تیار کیا گیا، اور اُنھوں نے ہندوستانی رائفلوں، مشین گنوں اور بموں سے محبت کو تباہ اور امن کو جلا دیا۔ ہماری زندگی کو بے مزہ اور بے چین کر دیا۔ اور پھر ہندوستانی پریس اور ریڈیو نے حیدرآباد دکن کو بدنام کرنے کے لئے پروپیگنڈا شروع کر دیا۔"

(خطبۂ صدارت بابتہ ۱۹۴۸ء)

گوبلز کے نقشِ قدم پر

ساتھ ہی ہندوستانی پریس اور آل انڈیا ریڈیو نے حیدرآباد کے خلاف زہریلا پروپیگنڈا شروع کیا بے بنیاد اتہامات اور مسلمانوں کے مظالم کے من گھڑت واقعات سے عالمی رائے عامہ کو متاثر کرنے کی سعی کی گئی — لیکن دنیا دھوکہ نہ کھاسکی، اور خود ہندوستان کے بعض اخبارات مثلاً "اسٹیٹسمین" اور "ٹائمز آف انڈیا" نے متعدد مرتبہ جھوٹی اطلاعات کی فراہمی پر احتجاج کیا۔ لندن کے ایک روزنامہ "ڈیلی ایکسپریس" کے مراسلہ نگار نے ستمبر ۱۹۴۸ء میں اس حقیقت کا اظہار کیا کہ مبالغہ آمیز خبروں کی ذمہ داری محض کے۔ ایم۔ منشی (حیدرآباد میں انڈیا کے ایجنٹ جنرل) پر عائد ہوتی ہے۔ اس مراسلہ نگار نے آل انڈیا ریڈیو کی مبیّنہ قتل کی وارداتوں کی بذاتِ خود تحقیق کی اور انھیں بے بنیاد پایا۔ اسی زمانہ میں "ہندوستان ٹائمز" نے ایک خبر شائع کی کہ حیدرآباد کے

ایک قصبہ میں ایک ہزار ہندوؤں کو قتل کر دیا گیا ہے۔ اس خبر کی تحقیقات کے لئے "اسٹیٹسمین" کے ایڈیٹر موقع واردات پر پہونچے۔ لیکن اُنھیں معلوم ہوا کہ کچھ مسلمانوں کے قتل کی وجہ سے ایک ہنگامہ ہوا تھا جس میں صرف تین ہندو زخمی ہوئے ہیں ـــــ ان مبالغہ آمیز اور بے بنیاد خبروں سے حیدرآباد کے ہندوؤں میں دہشت پھیلائی گئی، اور اُنھیں اس غرض سے وطن چھوڑنے پر مجبور کیا جانے لگا کہ آئندہ انڈیا یونین کو اندرونی انتشار اور خلفشار کے حیلے سے مداخلت کا موقع مل سکے۔

قاسم رضوی نے صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے کہا:

"عوام کو جلاوطن ہونے پر آمادہ کیا گیا۔ ہندوستان نے طاقت کے استعمال کا موقع حاصل کرنے کے لئے سفید جھوٹ کو شعار بنالیا۔ مہاسبھائی ذہنیت پھیلائی گئی .... اور ہندوستانی خبر رساں ایجنسیوں میں ایک بھی نہیں ہے جو اتفاقاً ہی سچ بولتی ہو۔ ہندوستانی مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے اعلامیے بھی جھوٹ کے شاہکار ہوتے ہیں ـــــ اور جب حکومت اور پریس دونوں ملکر جھوٹ بولتے ہیں تو جھوٹ بھی شرمندہ ہونے لگتا ہے۔ یہ طریقہ اُس وقت استعمال ہوتا ہے جب کوئی حکومت اپنی کی جانے والی بداعمالی یا رویہ عمل لائی جانے والی بدنیتی کے لئے زمین ہموار کرنے کی خاطر بے بنیاد

خبروں کو اخباروں کے ذریعہ اُچھالتی ہے ـــــ ہم جانتے
ہیں کہ حیدرآباد پر دہشت طاری کرنے کے لئے ایسا کیا
جارہا ہے، اور بعض خبریں تو اس طرح شائع کی جارہی
ہیں گویا کہ وہ حیدرآباد کی مسلمہ ہیں........... دوسرا
دروغ بافی کا ذریعہ آل انڈیا ریڈیو ہے جس کی آواز پر شیطان
بھی کان میں انگلیاں رکھ لیتا ہے.. انگشت بدنداں ہوتا ہے
اور اُس کی جھوٹ کی ندرت پر محوِ حیرت ہوتا ہے.......
اس دروغ بافی میں سردار پٹیل کو اولیت حاصل تھی. لیکن
مسٹر گیڈ گل بھی اُن کے قائم مقام نکلے. اور پنڈت نہرو نے تو
اب سب کو مات کر دیا ہے. اُن کے غیض و غضب کا یہ حال ہے
کہ جب وہ تقریر کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو غالب کی روح اُن
کے اندر سما کر کہنے لگتی ہے ع

بک گیا ہوں جنون میں کیا کیا کچھ ؛ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

نہ وہ خود اپنے کہے کو سمجھتے ہیں نہ اُن کے سامعین بغور سُن کر
بھی کچھ سمجھ پاتے ہیں. .... اس پروپیگنڈے سے
ہندوستان کے عوام اراداتًا متاثر ہوئے. لیکن اقوامِ عالم
جو گوبلز کی فن کاریوں سے دھوکہ کھا چکے تھے. سردار پٹیل
سے فریب کھانے پر آمادہ نہ ہوئے ـــــ اقوامِ عالم کے نمایندے
حیدرآباد آئے. اُنھوں نے حکومت کی بدانتظامی، رضاکارو

کی "بد اعمالی"، "طوائف الملوکی" بھی دیکھی، اور نعشوں کا قبرستان بھی دیکھا، اور جب آنکھیں کھولیں تو سردار پٹیل کا ہندوستان نظر آیا! اور حیدر آباد کے متعلق سب نے متفق ہو کر کہا ع

اگر فردوس بر روئے زمین است

ہمین است وہمین است وہمین است!

اُنھوں نے اعتراف کیا کہ سارے ذیلی براعظم میں یگانگت اگر کہیں ہے تو مملکتِ دکن میں ہے۔ حریت کہیں ہے تو آزادیٔ دکن میں ہے، اور اخوت و محبت کہیں ہے تو مسلمانوں کے آئین اور دکن کی تہذیب کہن میں ہے!"

(خطبۂ صدارت بابت ۱۹۴۸ء)

معاشی ناکہ بندی

جب حیدر آباد کی سرحدوں پر قیامت خیز ہنگاموں اور اُس کے خلاف شدید پروپیگنڈے سے مقصد حاصل نہ ہو سکا تو انڈیا یونین نے حیدر آباد کی مکمل معاشی ناکہ بندی کر دی۔ انگریز کے دورِ حکومت میں حیدر آباد ساحلی علاقوں اور بندرگاہوں سے محروم ہو گیا تھا اور اُس کی حیثیت محض ایک جزیرہ کی سی رہ گئی تھی۔ اس جغرافیائی کمزوری سے انڈیا یونین نے فائدہ اُٹھایا اور تمام ضروریاتِ زندگی کی رسد کا سلسلہ منقطع کر کے حیدر آباد کو شرکت پر مجبور کرنا چاہا۔ یہاں تک کہ نمک اور ادویہ کی سی ناگزیر ضروریات کو بھی نظر انداز کر دیا گیا۔ صرف شہر حیدر آباد کو پانی کی

صفائی کے لئے ماہانہ پانچ ہزار پونڈ کلورین کی ضرورت تھی، لیکن ۱۹۴۸ء کے نصف اول میں ساری ریاست کے لئے صرف تین ہزار پونڈ کلورین دی گئی۔ نتیجتاً سخت وبائیں پھوٹ پڑیں، اور عوام کا سخت جانی نقصان ہوا۔ عیسائی مبلغین نے رائے عامہ کو مانچسٹر گارجین کے ذریعہ صورتِ حال سے آگاہ کیا لیکن ہندوستان ٹس سے مس نہ ہوا۔

قاسم رضوی نے اپنے خطبۂ صدارت بابتہ ۱۹۴۸ء میں اس انسانیت سوز حرکت کی اس طرح مذمت کی ہے:۔

"معاشی ناکہ بندی اس لئے کی گئی کہ ہم اپنی آزادی اور وحدت کو ختم کرنے پر مجبور ہو جائیں......... حکومت ہند کا مقصد یہ تھا کہ حیدرآباد کی مسلمہ آزادی سے منھ موڑا جائے۔ ۔ ناکہ بندی کا یہ حال ہے کہ اسلحہ تو کجا پُرامن رعایا کی جانیں بچانے کے لئے ادویہ تک ہمیں میسّر نہیں ہیں۔ نمک تو کجا کلورین بھی نہیں ہے۔ حیدرآباد کے اطراف ہندوستان کے غنڈے اور اُس کے نازی سپاہی پہرہ دے رہے ہیں اور ہمارے بچّے مر رہے ہیں۔ ادویہ نہ ہونے سے زچّائیں سسک رہی ہیں، اور سارے دواخانے عزاخانے بن گئے ہیں کلورین نہ ہونے سے وبائیں پھوٹ پڑی ہیں...... امبولینس کار اور فائر بریگیڈ کے لئے بھی پٹرول بند کر دیا گیا ہے ـــــ اور اس ساری تباہی کی ذمہ داری پنڈت نہرو کی

حکومت پر ہے جس نے اس ناکہ بندی کا اعتراف اور اعلان بھی کر دیا ہے!—— نازی جرمنی نے یورپی ممالک کے ساتھ حملہ کر کے ایسا سلوک نہیں کیا جو صلح کر کے انڈیا ہمارے ساتھ کر رہا ہے...... ہمیں نمک نہ ملے، کلورین نہ ملے، دوائیں نہ ملیں، پٹیل کی بلا سے، لیکن کانگریسی سرمایہ داروں کے کارخانوں کو کپاس نہ ملے تو نہرو کا کلیجہ ہل جاتا ہے......

آپ کے عارضی معاہدہ کا یہ حال ہے تو دوامی معاہدہ کا کیا عالم ہوگا؟ یہ وبا کے عارضی ہے اور مرگِ ناگہانی تو وہ آزارِ دوامی ہوگا اور مرگِ جاودانی!"——

رضاکار ہندوستان کی ہر تدبیر ناکام ہوتی گئی، اُس کا پروپیگنڈہ عالمی رائے عامّہ کو متاثر نہ کر سکا، اور معاشی ناکہ بندی سے "ضرورت ایجاد کی ماں ہے" کے مصداق حیدرآباد خود مکتفی ہوتا گیا—— ہندوستان کا ہر اقدام اہلِ دکن کی صلاحیتوں کو اُجاگر اور اُن کے عزم کو مستحکم کرنے کا باعث ہوا! اُن کی آزادی کو انڈیا کی طرف سے شدید خطرہ لاحق تھا، اور تنظیم رضاکاران مدافعت کے لئے اُن کے عزمِ صمیم کا نتیجہ تھی۔ انڈیا یونین کی غیر مذہبی حکومت کی برکات دنیا کے سامنے تھیں۔ دہلی میں بجلیاں کڑک رہی تھیں، بھرت پور میں بادل گرج رہے تھے، مشرقی پنجاب میں خون کے طوفان اُمڈ رہے تھے۔ بہار اور بنگال

میں موت کی آندھیاں چل رہی تھیں، اور کشمیر میں زلزلہ آیا تھا اور زمین پھٹ گئی تھی! رات تاریک ہو چکی تھی اور تباہی کی گھٹائیں بندھیاچل کو عبور کر کے بالا گھاٹ[1] پر منڈلا رہی تھیں! ناگاہ تاریکیوں کو چیرتی ہوئی ایک روشنی نمودار ہوئی جس نے ضمیرِ حیات کو روشن اور عزائم کو سینے میں بیدار کر دیا! ——— ہلاکت خیزیوں میں قاسم رضوی نے اہلِ دکن کو زندگی کا پیام دیا۔ انھوں نے اسرارِ مرگ و حیات کو فاش کیا اور شہادت کے حسین چہرے سے موت کے تاریک اور ہیبت ناک نقاب کو اُٹھا کر شوقِ شہادت کو مسلمانوں کے دل میں مستحکم کیا! اُنھوں نے خرد کو غلامی سے آزاد کیا، تصورات کو خونِ دل سے سینچا اور جوانوں کو سوزِ جگر بخشتا ——— صدیقِ دکن نے اہلِ دکن کو سوزِ صدیق رضؓ عطا کیا! ———
اور پھر پستی کا دور ختم ہوا، خوابیدہ مسلمان سنبھلنے لگے اور سطحِ مرتفع دکن کی رگوں میں خون موجزن ہوا ——— ! ہر جگہ رضا کار جماعتیں قائم ہوئیں، ہر شہر اور ہر قریہ میں سرفروشانِ دکن کی پریڈ ہونے لگی، اور مجاہدینِ دکن کی چاپ سے ہمالیہ کا دل ہلنے لگا! حریّت کی روح بیدار ہوئی اور عسکریت کا جوہر اُجاگر ہونے لگا، جس کو صدیوں کی امن پسندی نے زنگ آلود کر دیا تھا! ——— رضا کاروں کی اُمنگوں اور آرزوؤں سے فضا معمور ہوئی، اور اُن کی اُمیدیں اور جستجوئیں خدا کے رازدانوں میں شامل ہو گئیں ——— ! اور اصل ارضِ دکن پر

---

[1] دکن کا ایک پہاڑی سلسلہ

رضاکار تحریک زندگی کا معجزہ بن گئی ـــــ ملّت کا شباب، مجسم ذوقِ انقلاب[1]!!

تنظیم کفن بدوش رضاکاروں کی ایک تربیت یافتہ جماعت تھی۔ جو لباس، نظم و ضبط اور مدارج و قواعد کے اعتبار سے باضابطہ فوج کے مماثل تھی۔ قاسم رضوی نے اس تنظیم میں زندگی کی روح پھونکی اور اطاعتِ امیر کا بے پناہ جذبہ پیدا کیا۔ اس تحریک کا مقصد حرّیت اور انسانیت کے تحفظ کے سوا کچھ اور نہیں تھا، جس کے لئے ہر رضاکار نے ہر قربانی اور ایثار کا اپنے خدا سے عہد کیا تھا ـــــ قاسم رضوی نے رضاکاروں سے مخاطب ہو کر کہا تھا:۔

"رضاکارانِ دکن! تمہارا راستہ آگے بڑھنا ہے۔ تمہارا عزم مصمم ہے، تم نے صعوبتوں کو دعوت دی ہے...... دشمنوں نے سرحدوں پر حملے شروع کر کے دعوتِ مبارزت دے دی ہے اور تم نے سرحدوں پر مورچہ بنا لیا ہے اور مر مٹنے پر کمربستہ ہو گئے ہو .... رضاکارو! تمہارا صبر و استقلال قابلِ تقلید ہے۔

---

[1] ضلع عثمان آباد میں حیات النساء بیگم صاحبہ نے پردہ دار خواتین کی رضاکار تنظیم قائم کی تھی۔ اُن کا ایک اعلیٰ تربیت یافتہ بٹالین تھا جس کا نام (اُس ضلع کے سب سے بڑے بزرگ حضرت سید شمس الدین غازی رضوی کے نام پر) غازی بٹالین رکھا گیا تھا۔ اپنی نوعیت اور کارکردگی کے اعتبار سے خواتین کی یہ واحد تنظیم تھی، جس پر قاسم رضوی کو بھی فخر تھا۔ حیات النساء بیگم صاحبہ کراچی آ گئی ہیں۔

تمہارا گھر لوٹا اور جلایا جا رہا ہے، اور تم اغیار کے گھر کی حفاظت کر رہے ہو...... تمہاری بستیاں مٹائی جا رہی ہیں، اور تم دوسروں کے وجود کے محافظ بنے ہوئے ہو...... تم اللہ کے بندے ہو جن کی تقدیر میں اللہ نے زمین کی حکومت لکھی ہے۔ تمہاری ہمت قابل تعریف، تمہارا جذبہ قابل ستائش۔ تم ظلم کا بدلہ رحم سے دے رہے ہو، تمہاری بستیاں لوٹی جا رہی ہیں اور تم ہموطنوں کی بستیوں کی حفاظت کر رہے ہو...... شاباش! خدا کے سپاہیو، تم اللہ کے سادہ بندے بن جاؤ، تم خودی کو اس قدر بلند کرو کہ تقدیر یزداں بن جاؤ —— یہی ہے شانِ مومن، یہی ہے شان مسلم۔ تمہارے وہ اخلاق ہوں کہ اغیار بھی اپنے ہو جائیں۔ تم اللہ کے ہو جاؤ تاکہ اللہ بھی تمہارا اور صرف تمہارا ہو جائے —— ! دکن کے رضا کارو! دنیا کی نگاہیں تم پر لگی ہوئی ہیں —— دوست کی بھی اور دشمن کی بھی! دوست کی اس لئے کہ وہ تمھیں کامیاب، کامران و شادکام دیکھنا چاہتا ہے اور دشمن کی اس لئے کہ وہ تمھیں ناکام اور نامراد دیکھنا چاہتا ہے! مٹ جانا مگر اسلام کے نام پر دھبّہ نہ آنے دینا، ملتِ اسلامیہ کی آبرو تمہارے ہاتھ ہے، ...... تم کو بدنام کیا جا رہا ہے لیکن بدنام کرنے والے اپنی بدنامی کا شہرہ چار دانگِ عالم میں سُنیں! تم پر الزام لگانے

والے دلّی اور جونا گڈھ کی مسجدوں میں ناقوس کی آوازیں
سُنیں! حیدر آباد کی گلیوں اور بازاروں میں ہندوؤں کی
چہل پہل دیکھیں، اور مسلمانانِ ہند کو اپنی جیلوں میں بند
دیکھیں۔"

(ماخوذ از خطبۂ صدارت بابتہ ۱۹۴۶ء)

قاسم رضوی کی آئین پسندی نے اس جماعت پر ممکنہ پابندیاں عائد کردی تھیں اور قیامِ امن رضاکاروں کی نگرانی اور شرپسندوں کے استیصال کے لئے مجالسِ اضلاع کے تمام صدور کو اُنھوں نے سخت ہدایات بھی دیدی تھیں۔ انہی ہدایات کی روشنی میں مختلف مقامات پر مختلف السدادی تدبیریں اختیار کی گئیں، اور جہاں تک مجلس[1] عثمان آباد کا تعلق ہے مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہم نے اپنے اختیارِ تمیزی سے تمام مسلمان وکلاء کو کسی رضاکار کی جانب سے فوجداری مقدمات میں پیروی سے ممنوع کردیا تھا۔ نیز "زراعت کمیٹی" کے نام سے ذمہ دار ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک جماعت قائم کی تھی جس کی سفارشات پر شرپسند رضاکاروں کو سزائیں دی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ ہم نے مجلس ضلع میں ایک "شعبہ السدادِ جرائم" بھی قائم کیا تھا جس کے صدر مجلس کے ایک مستعد اور دیانتدار کارکن غلام نبی صاحب[2] مقرر ہوئے تھے۔ ان کا یہ فرض تھا کہ ضلع

---

[1] اکرام اللہ کو جب لائق علی کابینہ میں لیا گیا تو اُن کی جگہ راقم الحروف کو باتفاقِ رائے مجلس ضلع کا صدر منتخب کیا گیا۔
[2] غلام نبی صاحب کراچی میں موجود ہیں۔

بھر کا دورہ کرتے رہیں اور خطادار رضاکاروں کو گرفتار کر کے مجلس ضلع میں پہنچا دیں جن کے بارے میں ہم نے کلکٹر سے یہ طے کیا تھا کہ انھیں بغیر کسی تحریر یا کارروائی کے سرکاری جیلوں میں اُس وقت تک مقید رکھا جائے جب تک کہ ان کی اصلاح نہ ہو جائے —— یہ طریقۂ کار بہت مفید اور مؤثر ثابت ہوا اور گرفتاری کے چند واقعات ہی نے شر پسندوں کا استیصال کر دیا!

فیلڈ مارشل غالباً ماہ مئی ۱۹۴۸ء میں نظام کی سالگرہ منائی گئی۔ اس موقع پر ملک پیٹھ کے میدان میں حیدر آباد کے تین لاکھ تربیت یافتہ رضاکاروں کا اجتماع ہوا —— آزادی کے نغمے اُبل پڑے، نعرۂ تکبیر سے لال قلعہ کی دیواریں ہل گئیں، اور آسمانوں میں زلزلہ آگیا! نظم و ضبط اور جوش و خروش کا ایسا روح پرور منظر ارض دکن پر کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ قاسم رضوی نے جیپ کار میں رضاکاروں کی صفوں کا معائنہ کیا۔ جیپ دو گھنٹے چلتی رہی اور ایک او نچے مقام پر آکر رُک گئی۔ پھر سلامی ہوئی اور قاسم رضوی نے رضاکاروں سے مخاطب ہو کر اُن کے جوشِ عمل اور ایثار و قربانی کی تعریف کی اور اس امر کی وضاحت کی کہ صالح بندے ہی زمین کی حکومت کے وارث ہو سکتے ہیں۔ ملک میں تربیت یافتہ رضاکاروں کی تعداد پانچ لاکھ سے متجاوز ہو چکی تھی، اس لیے "قاسم رضوی کو رضاکار تنظیم کی جانب سے "فیلڈ مارشل"

کا عہدہ دیا گیا۔

شام کو نظام نے ایک انگوٹھی قاسم رضوی کو تحفتاً روانہ کی، اور لکھا کہ :-

"تمہارا احسان میرا خاندان کبھی نہیں بھلا سکے گا"

قاسم رضوی نے انگوٹھی واپس کر دی اور جواباً تحریر کیا کہ :

"میری مسرت صرف یہ ہے کہ ہر سال آزادی کا پرچم لہراتا رہے"

عزمِ آزادی ہندوستان کی بربریت میں اضافہ ہی ہوتا گیا اور اب سرحدی ہنگاموں میں اُن کی باضابطہ فوجوں نے بھی حصہ لینا شروع کیا۔ حکومت ہند نے اُنھیں حیدرآباد کی سرحدوں کے اندر داخل ہونے کی بھی اجازت دے دی۔ جس کے باعث بے شمار خوں ریز واقعات رونما ہوئے ـــــ لیکن اہلِ دکن کا عزمِ آزادی چٹان کی طرح غیر متزلزل رہا!

"..........اور پاکستان کو بے گور دکفن نعشوں کے لئے قبریں کھودنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن زندہ باد قائدِ اسلامیانِ ہند! زندہ باد مجاہدانِ پاکستان اور پائندہ باد اے مملکتِ اسلامیہ پاکستان! تو نے غلامانہ زندگی پر موت کو ترجیح دی اور تیرے عزم نے موت سے بچا کر تجھے حیاتِ جاوداں بخشی!......

وہی ہندوستان جس نے پاکستان کو خطرہ میں ڈالا تھا۔ دکن

کی سلطنت کو کس طرح آزاد دیکھنا گوارا کرسکتا تھا! اُس نے
اس کو لقمۂ تر سمجھا، لیکن زندہ باد اے مسلمِ دکن اور پائندہ باد
اے مملکت اسلامیہ دکن! تیرے عزمِ محکم نے دکن کی بوسیدہ
کشتی کو متلاطم سمندر میں ڈوبنے سے بچا لیا........ حیدرآباد
نے ہندوستان کے ساتھ دوستی کی خاطر معاہدۂ جاریہ کیا اور
حقیقت پسندانہ انداز میں دبتا ہوا معاہدہ کیا........ ہم نے
دفاع، امورِ خارجہ اور مواصلات اُن کے سپرد کرنے کا ایجاب
کیا، اور اُن سے تعاونِ عمل کرنا چاہا۔ ہم نے برطانوی اقتدار
کو رودِ موسیٰ میں غرق کر دیا، اور اپنی آزاد مرضی سے دورانِ
معاہدہ تک کے لئے چند پابندیاں عائد کر لیں، لیکن ہندوستان
کا دیو حیدرآباد کو زندہ نگل جانا چاہتا تھا۔"

(خطبۂ صدارت بابتہ ۱۹۴۸ء)

قانون آزادیٔ ہند بابتہ ۱۹۴۷ء نے ریاستی حکمرانوں کو یہ حق دیا
ہے کہ وہ آزاد رہیں یا کسی قلمرو میں شریک ہوں. نظام نے اسی قانون
کے مطابق اپنی آزادی کا اعلان کیا، لیکن انڈیا یونین نے یہ استدلال
کیا کہ حقِ خود ارادیت دکن کے عوام کو حاصل ہے نہ کہ نظام کو. نظام
کی طرح مہاراجہ کشمیر نے بھی اپنے اختیار کو استعمال کیا، اور جب پاکستان
نے احتجاج کیا تو انڈیا یونین نے بحث کی کہ مہاراجہ نے جو کچھ کیا ہے
وہ قانون کے عین مطابق ہے!

"پنڈت نہرو نے کہا کہ حیدر آباد صرف ہندوستان کی موت کی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے۔ پٹیل نے اِس کو ہندوستان کے پیٹ کا ناسور کہا۔ اور پھر حیدر آباد کو موت کا پیغام دیا گیا۔ اور اُس کی معاشی ناکہ بندی کر کے اُس کی حدود میں فوج کو داخل ہونے کا حکم بھی دے دیا گیا —— یہ ہیں آزادی کے علمبردار، انسانیت کے ٹھیکہ دار، اہنسا کے پجاری...... کشمیر میں پچانوے فی صد کو حق خود ارادیت حاصل نہیں ہو سکتا، بلکہ مہاراجہ کو اپنی مرضی سے انڈیا میں شرکت کا اختیار دیا جاتا ہے۔ لیکن حیدر آباد کے متعلق اُن کا استدلال بدل جاتا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ مسلمان بادشاہ کو یہ حق حاصل نہیں ہے، بلکہ یہ حق اُن کے پچاسی ۸۵ فیصد منہ بولے بھائیوں کو حاصل ہے۔"

(خطبۂ صدارت بابت ۱۹۴۸ء)

انڈیا یونین کی ایک دلیل یہ بھی تھی کہ حیدر آباد معاشی اعتبار سے انڈیا کا دست نگر ہے اس لئے آزاد نہیں رہ سکتا، حالانکہ دنیا میں متعدد ایسے آزاد ممالک موجود ہیں جو چاروں طرف سے محصور ہیں، اور معاشی اعتبار سے بھی خود مکتفی نہیں ہیں۔ خود ہندوستان بھی دوسرے ممالک بالخصوص پاکستان کا محتاج ہونے کے باوجود آزاد ہے ——

"....... حکومت ہند ہمارے ملک پر قتل و غارت گری نازل کرنا چاہتی ہے۔ ہندوستان معاشی مجبوریوں کے باوجود آزاد ہے اور پاکستان کا دست نگر ہونے کے باوجود زندہ ہے۔ مگر حیدرآباد کو آزادی اور زندگی سے محروم کرنا چاہتا ہے۔

.... ہندوستان قتل و غارت گری اور وحشت و بربریت کے باوجود آزاد ہے۔ لیکن حیدرآباد میں تباہی اور غارتگری کے حیلے سے جو دراصل خود اُس کے بھیجے ہوئے غنڈوں کی پیدا کردہ ہے۔ وہ ہماری آزادی کو چھین لینا چاہتا ہے۔ —— یہ بالکل اُس بھیڑیئے کی منطق ہے جو نہر کے بہاؤ کے نیچے پانی پینے والے بکری کے بچّے کے ساتھ اُس نے کی ہے

.... حیدرآباد نے تعاون کا ہاتھ بڑھایا اور انصاف کا طالب ہوا۔ لیکن پیام محبت کا جواب دشمنی سے دیا گیا۔ یہ ہے وہ سلوک جو بھیڑیئے نے بکری کے بچّے کے ساتھ کیا تھا۔ مگر اس بکری کے بچّے نے جب عزت کی موت کا تہیہ کر لیا اور پانی پینے کے لئے نہر پر پہنچا تو حقیقت اُس پر آشکار ہوئی۔ اُس نے اپنا عکس پانی میں دیکھا .... اور بھیڑیئے کی طرف بڑھا۔ تب بھیڑیئے کو معلوم ہوا کہ یہ شیر ہے، ڈرنے والا نہیں، فولاد کا چنا ہے —— اُس کا جنگل ہے .... وہ بھیڑیا جتنا چاہے غرّلائے لیکن اُس

کے جنگل سے دُور ــــــ ورنہ ایک برق ہوگی جو ہندوستان
کے خرمنِ امن کو جلا کر خاکستر کردے گی ۔"

(ماخوذ از خطبۂ صدارت بابت سنہ ۱۹۴۸ء)

انڈیا یونین حیدرآباد کے عوام کو کس طرح آزاد کر سکتا تھا جبکہ
خود اُس کے عوام کے پاؤں میں غلامی کی زنجیریں ڈال دی گئی تھیں :-

"قومیت کے انوکھے طور طریق ہیں ۔ کمیونسٹ جماعت کو غیر آئینی
قرار دیا گیا ، سوشلسٹوں پر پابندیاں لگادی گئیں ۔ تحریر ، تقریر
اور تدبیر پر قیود عائد کی گئیں ــــ یہ آزادیِ ہند ہے ! ہزاروں
سال کے بعد غیر برہمن کو آزادی کی امید کی جھلک نظر آئی لیکن
برہمن نے ساری اُمیدوں پر پانی پھیر دیا ــــ یہ غلامی
نہیں ہندوستان کی آزادی ہے ! مبارک ہو ہندوستان
کے کروڑوں غلاموں کو یہ آزادی ، بھوکوں کو ڈالمیا کا اقتدار
اور مجبوروں کو پنڈت جی کی حکومت ! .... کانگریس
ہی کے کچھ تار ڈھیلے اور کچھ تنگ ہیں ۔ رنگ میں بھنگ معلوم
ہوتا ہے ۔ سردار پٹیل اور پنڈت نہرو کے بھی تاروں کی آواز
مختلف ہے .... یہ ہے کانگریس کے نغموں کا حال
ــــ لیکن سوشلسٹ بگل کی آواز بھی سنائی دیتی ہے جس
نے کانگریس کی آوازوں کو مدھم کر دیا ہے اور کمیونسٹ ماتوس
اور نقاروں کی آوازیں بھی قریب ہو رہی ہیں ۔ خدا جانے

کانگریس کی تو اوس کا کیا حال ہوتا ہے۔ کب یہ میلا بنتا ہے
کب یہ میلا میدانِ جنگ ہو جاتا ہے اور کب مہا بھارت
کا واقعہ تاریخ ہند نہیں سیاستِ ہندو ہراتی ہے۔"

(ماخوذ از خطبۂ صدارت بابتہ ۱۹۴۸ء)

حیدرآباد نے قیامِ امن کے لئے ہر طرح تعاون کرنا چاہا۔ وہ
آگے بڑھتا گیا، لیکن ہر گام پر قوس قزح پیچھے ہی ہٹتی چلی گئی!

حیدرآباد نے نا عاقبت اندیش اشخاص کے برعکس اپنے
حالات کا جائزہ لے کر اور دنیا کو گواہ بنا کر اپنے ہمسایہ سے
تعاون کے لئے ہاتھ بڑھایا، لیکن ہم دبتے گئے اور وہ
دباتے گئے۔ "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" ہم بہت
بڑی قربانی پر بھی راضی ہوئے لیکن :

"وہ ستم گر میرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا"

ہم وفا کئے جاتے ہیں راہِ محبت میں۔ ہماری وفاؤں کا یہ حال ہے
اور اُن کی جفاؤں کا وہ حال۔ تو پھر ہم اُن ہی کی آستان پر
کیوں جبیں سائی کریں.......... "تو پھر اے سنگدل!
تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟"...... ہم بڑھ سکتے ہیں،
وہاں تک جہاں مرض کی حد ختم ہوتی ہے اور موت کی
حد شروع ہوتی ہے۔ جہاں خسارہ ختم ہوتا ہے اور دیوالیہ
کی حد شروع ہوتی ہے، اور جہاں نقصان ختم ہوتا ہے اور

بتاہی کا آغاز ہوتا ہے ۔ لیکن ان حدود سے ہم آگے نہیں
بڑھیں گے .... ہندوستان کی جس قدر دلجوئی کی گئی
اُسی قدر ناز بڑھتا گیا۔"

(ماخوذ از خطبۂ صدارت بابت ۱۹۴۸ء)

باعزت سمجھوتے کے لئے ہندوستان کبھی راضی نہ ہوا۔ ابتداءً ماونٹ بیٹن نے استصواب رائے عامہ کی خواہش ظاہر کی تھی لیکن اُن کے جانے کے بعد انڈیا گورنمنٹ نے اس سے بھی انحراف کیا۔ مسلمانوں کے علاوہ حیدرآباد کے انتیس لاکھ اچھوت اور دیگر متعدد اقلیتیں آزادیٔ حیدرآباد کے حامی تھیں، اور انڈیا کو استصواب میں کامیابی کی کوئی اُمید نہیں تھی۔ اس لئے ہر مرتبہ ایک نیا عُذر پیدا کیا جاتا، اور معاملہ کو سلجھانے کی بجائے اُلجھایا جاتا۔

"ہمارا وفد جب بحث و مباحثہ کر کے مسائل پر غور کرنے
اور شاہ ذی جاہ کی منظوری حاصل کرنے کے لئے دستاویز
لاتا اور پھر واپس جاتا تو اُس کو نئی شرائط دی جاتیں، اور
ہمارے لئے مفید شرائط کو گھٹایا جاتا۔ ۔۔۔ حیدرآباد کے
لئے مرنا ہی ٹھیرا تو پھر ہندوستان کا دیا ہوا کڑوا زہر
کیوں پیئے، اور ایسا زہر کیوں پیئے کہ جس سے فوراً موت
نہ آئے بلکہ ایک طویل عرصہ تک سسکتی ہوئی زندگی بسر ہو جائے۔
سنیئے یہ ہے آخری پیام موت:۔

۱۔ حیدرآباد عملاً انڈیا یونین میں شریک ہو جائے۔
۲۔ آبادی کے تناسب کی اساس پر ذمہ دارانہ حکومت قائم کی جائے
۳۔ اسی تناسب کے لحاظ سے عبوری دور کے لئے وزارت قائم کی جائے۔
۴۔ یہ عارضی حکومت مجلس آئین ساز بنائے جو چھ سال تک قابل تبدیل نہ ہوگی۔
۵۔ جدید آئین وضع ہونے کے بعد تناسب آبادی کے لحاظ سے مجلس دستور ساز بنے۔
۶۔ حیدرآباد کی نیک نیتی کے ثبوت میں تنظیم رضاکاران کو ختم کیا جائے۔

........سارے جھگڑوں اور مباحثوں کی ضرورت کیا ہے، جب موت ہی آنے والی ہو تو اس کی کیا بحث کہ نعش کو کفن میں لپیٹا جائے گا یا ٹاٹ میں...... عطر اور کافور ملا جائیگا یا خاک و خون، میت کو قبرستان تک بنڈی میں لے جایا جائے گا یا کندھوں پر......... یہ سب کچھ مرنے کے بعد کے سامان ہیں، مرنے سے پہلے کیوں سوچا جائے؟.... ع

ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

آزادی کی خاطر مرنے والے تیرے مرنے

بھی شان رہے، ہندوستان کی شرائط موت کے لئے ہیں، بلکہ اُلٹی شرطیں ہیں۔ مرنے کے بعد حکیم اصول مرتب کریں، اور پھر موت کے تمنائیوں کو جمع کرکے پوچھیں کہ موت کی ضرورت ہوگی یا نہیں ــــــ! ہم فتنہ و فساد کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ ہم ضرورتوں کی حد بندی کر رہے ہیں اور معاشی آزادی کی ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے ہیں۔ ہم زندہ رہیں گے اور آزاد زندگی بسر کریں گے۔ ہم معاشی مقاطعہ پر ہنس رہے ہیں، ہم طارق اور خالد کی طرح مقابلہ کریں گے ــــــ جیئیں گے تو عزت کے ساتھ اور مریں گے تو عزت کے ساتھ! اگر پیغام صلح ہو تو ہند کی طرف سے ہونا چاہیئے اور اعلانِ جنگ ہو تو بھی اُسی کی طرف سے ہونا چاہیئے۔ ہم نے سب کچھ کیا، تعاون کرنا چاہا، مقاصدِ قیامِ امن کو پیشِ نظر رکھکر اپنی فوج پر پابندیاں عائد کیں، ان کے مفاجاتی قوانین کو اپنے ملک میں اپنی حکومت کے ذریعے نافذ کرنے کے لئے ہم راضی ہوئے ــــــ لیکن "وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا!" ہندوستان نے مفاہمت کی تابوت میں آخری کیلا لگا دیا، اور ہم نے اس کو جلا کر سپردِ خاک کر دیا! ــــــ ہم نے اُس کی اچھائیوں اور بُرائیوں کو بھی بُھلا دیا!! ــــــ ہم نے ثابت کیا کہ ہم سارے ہندوستان میں بلکہ ایشیاء اور ساری دنیا

میں قیامِ امن کے لئے ہر قسم کی قربانی دے سکتے ہیں، اور اپنی آزادی کو محدود بھی کر سکتے ہیں۔ ہم نے جو کچھ دینا گوارا کیا تھا اُس کے دینے کے لئے تیار ہیں اور جو کچھ لینا چاہا تھا اُس کے لئے بھی راضی ہیں۔ اب بھی ہم غیر معقول بننے پر تیار نہیں ہم مردم آزار نہیں ...... لیکن انقطاعِ گفتگو کے بعد ہندوستان کے صدر نے یقین کے انداز میں کہہ دیا کہ اب نہیں، ہزار بار نہیں! ہم نے التجا کی، منت کی، کہ غصہ سہی، ادا سہی لیکن ایک نہیں کی بھی نہیں! ...... ہم صلح پر آمادہ ہیں لیکن یہ سب کچھ از سرِ نو ہو گا ورنہ کچھ نہ ہو گا!

(خطبۂ صدارت بابت ۱۹۴۸ء)

قاسم رضوی نے اپنی موجودہ حربی قوت کا غلط اندازہ نہیں کیا تھا، بلکہ بغیر کسی ذہنی تحفظ کے سارے عالم کو آگاہ کر دیا تھا کہ:-

"مسلمانانِ عالم! ملتِ اسلامیہ دکن کا حال سنو۔ ہم سات سو برس سے مطمئن اور مرفہ الحال تھے۔ لیکن آج انتقام کی بجلیاں چمک رہی ہیں اور آسمانوں میں تباہی کے مشورے ہو رہے ہیں۔ ہمارا سات سو سالہ تمدن تباہ ہونے والا ہے۔ تمہارے بھائی قتل ہونے والے ہیں، تمہاری بہنوں کی آبرو ریزی ہونے والی ہے، اور تمہارے بچے غلام ہونے والے ہیں ـــــ اور ہم اپنے چاہنے والوں سے ایک ہزار میل دور موت کا انتظار کر رہے

ہیں ۔ ہمارا مقابلہ درندوں سے ہے، اُن سے ہے جن سے پاکستان اور کشمیر کا مقابلہ ہو رہا ہے اور جنھوں نے آپ کے ساڑھے چار کروڑ بھائیوں کو غلام بنا لیا ہے ۔" (خطبۂ صدارت بابت ۱۹۴۸ء)

مجلس اتحاد المسلمین کا حزب اختلاف آزادیِ دکن کے بارے میں قاسم رضوی سے ایک قدم آگے ہی تھا۔ چنانچہ زین کے حملہ سے ایک عرصہ قبل مجلس کے سالانہ اجلاس میں احمد عبداللہ المسدوسی اور عبدالرحمٰن رئیس نے ایک قرارداد پیش کی تھی کہ انڈیا سے تمام تعلقات منقطع کر کے حالتِ جنگ کا اعلان کر دیا جائے[1]۔ مولانا مظہر کی تائید بھی قاسم رضوی کو حاصل تھی، چنانچہ آزادیِ دکن کی تحریک سے دنیا کو روشناس کرنے کے لئے ایک وفد کے ساتھ وہ مشرقِ وسطیٰ گئے تھے۔

مسلمانانِ دکن اپنی ساری کمزوریوں کے باوجود آزادی کا عزم کئے ہوئے تھے، اور غلامی کی زندگی پر موت کو ترجیح دیتے تھے!

عقل ہے محوِ تماشہ

اہل دکن کا یہ عزمِ آزادی اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا اور انھوں نے طے کیا کہ ایک مخالف تحریک بڑے پیمانہ پر شروع کرنے کے لئے سُندر بھون[2] میں جلسۂ عام طلب کیا جائے۔ تاریخ مقرر ہوئی۔ اور ریاست بھر کے مخالف عناصر جمع ہوتے گئے۔ ـــــ غالباً مئی کا مہینہ اور جمعہ کا روز تھا۔ سُندر بھون

---

[2] سُندر بھون آریہ سماجیوں کا بہت بڑا مندر ہے۔ [1] لیکن یہ قرارداد منظور نہیں ہوئی۔

کا وسیع احاطہ تنگیِ داماں کی شکایت کر رہا تھا۔ ڈھائی لاکھ مسلم جوانوں کے نعروں سے آسمان پھٹا پڑتا تھا، جوش تھا، غضب تھا، اُن کے جگر کا لہو آنکھوں کی راہ سے بہنے کو تھا ـــــ اور اُن کا ایک جلوس تھوڑی دیر میں شہر کی شاہراہوں سے گزرنے والا تھا۔ حفظِ امن کے لئے پولیس تیزی سے انتظامات کر رہی تھی، حکومت کا دل دھڑک رہا تھا شہر حیدر آباد میں ایک بھونچال آنے والا تھا ـــــ اتنے میں سندر بھون کے دروازے پر ایک موٹر رُکی اور قاسم رضوی موٹر سے اُتر کر نہتے و تنہا اندر داخل ہوئے۔ جدھر وہ آنکھ اُٹھا کر دیکھتے گئے، اُدھر راستہ صاف ہوتا گیا۔ اور غیظ و غضب کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی موجوں کو اُن کی تیز نگاہ چیرتی گئی! وہ پنڈال کے اندر پہنچ گئے[1]، صدر جلسہ نے اُن کا استقبال کیا اور اُنھوں نے اُس کی اجازت سے جلسہ کو مخاطب کیا:

"میرے بھائیو! تمہارا غصّہ مجھے گوارا، تمہارا غیض و غضب مجھے منظور لیکن تم اس طرح نہ اپنے لئے آزادی حاصل کر سکتے ہو نہ میرے لئے

---

[1] محمد خواجہ صاحب (مقدمۂ بی بی نگر میں قاسم رضوی کے ساتھ ملزم تھے اور اب رہا ہو کر کراچی آ گئے ہیں) کا بیان ہے کہ ہندو مہاسبھا کے سکریٹری کو جس کا نام غالباً کیسکر ہے ۱۹۴۹ء میں نظام کی موٹر کے آگے بم رکھنے کے الزام میں گرفتار کر کے اُن کے ساتھ سنٹرل جیل میں رکھا گیا تھا۔ کیسکر نے اُن سے کہا کہ سندر بھون کے پنڈال میں جب قاسم رضوی داخل ہوئے تو اُس نے پیچھے سے ڈبل بور کا فائر کرنا چاہا لیکن گھوڑا ٹوٹ گیا اور وہ بچ گئے مگر جب وہ واپس ہو رہے تھے تو "قاسم رضوی زندہ باد" کا نعرہ لگانے والوں میں وہ پیش پیش تھا۔!

ذرا سوچو ــــــ آؤ مسائل پر ٹھنڈے دل سے غور کریں، سر جوڑ کر بیٹھیں اور متفق ہو کر اٹھیں۔"

خون کے پیاسے مجمع سے کوئی حرکت سرزد نہیں ہوئی، کوئی حرکت تو کیا ادنیٰ آواز بھی بلند نہیں ہوئی۔ انتقام کی آگ سرد پڑ گئی، نارِ نمرود گلزار ہو گئی! ــــــ صدرِ جلسہ نے انھیں باہر تک پہنچایا اور "قاسم رضوی زندہ باد" کے نعرے سے سارا شہر گونج اٹھا!! ــــــ پھر کوئی جلسہ نہیں ہوا، کوئی جلوس نہیں نکلا، نگاہِ مردِ مومن نے طوفان کے رخ کو پھیر دیا!!!

اس واقعہ کی اطلاع سارے شہر میں ہو گئی اور دارالسلام میں چاہنے والوں کا ہجوم ہو گیا۔ اکابرینِ سلطنت نے اس حرکتِ رندانہ کو خلافِ مصلحت سمجھا اور قائدینِ مجلس نے اظہارِ حیرت کیا، لیکن مقامِ شوق سے کسی قلندر نے پکارا:۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

مجاہدِ اعظم

آزادی کی تحریک آگے بڑھتی گئی۔ بلندیوں نے اُس کے عزمِ سفر کا مذاق اُڑایا۔ طوفانوں نے اُسے روکنا چاہا اور سنگلاخ چٹانیں اُس کی راہ میں حائل ہو گئیں۔ لیکن گرمیِ حیات نے ہر مشکل کو برف کی طرح پگھلا دیا اور تصوّر و تخیّل کے منازل سے گزر کر آزادی ایک ٹھوس حقیقت بن گئی ــــــ! قاسم رضوی کے جوشِ کردار

نے تقدیر کے راز کھول دیئے اور اُن کے عزمِ جلیل نے قوم کو ذوقِ یقین عطا کر کے غلامی کی زنجیروں کو کاٹ دیا! اُنھوں نے آندھیوں میں آزادی کے چراغ کو روشن رکھا اور اُن کے سوزِ نفس نے پرستارانِ حریت کی رگ رگ میں بجلیوں کو رقصاں کر دیا!——
پھر اُن کے یقینِ محکم کی بے پناہ طاقتوں کو دیکھیے کہ نہتّی قوم کو مسلّح کرنے کے لئے بطورِ واقعہ زمین اسلحہ اُگلنے لگی اور آسمان ہتھیار برسانے لگے!!—— اس نوبت پر قوم نے اُن کی عظمت کا اعتراف کیا، اُن کے مقام کو پہچانا—— یہ مقام اوجِ ثریا سے بھی بلند ہے۔ آسمانوں سے بھی بلند! انسانی رفعت کی یہ وہ منزل ہے جہاں جبریل صیدِ زبوں کی حیثیت رکھتا ہے اور جہاں ہمتِ مردانہ عرش نشیں کو مسخر کرنے لگتی ہے—— وکٹری پلے گراؤنڈ پر ایک عظیم الشان جلسۂ عام منعقد ہوا۔ لاکھوں انسانوں نے محبت اور عقیدت کے پھول پہنائے، قرآن اور تلوار کا تحفہ پیش کیا، اور ایک زندہ و بیدار قوم نے صدیقِ دکن کو مجاہدِ اعظم کا خطاب عطا کیا!

سلامتی کونسل میں مقدمہ ان حالات میں سردار پٹیل نے محسوس کیا کہ دکن میں برہمنی راج کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا تو وہ چیخ اُٹھا اور اُس کی اس چیخ کو اُس کے ریڈیو نے دنیا

لہ ملاحظہ ہو صفحہ

میں پھیلا دیا کہ رضا کار تحریک کیا ہے؟ ایک وحشت ہے۔ ایک بربریت ہے، ایک گناہ ہے جو تعزیر کی مستحق ہے، ایک تاریکی ہے جو صرف اس لئے ہے کہ مٹا دی جائے! اور پھر اُس کی مسلح فوجوں نے ہمارے سرحدی مواضعات پر منتشر حملے شروع کر دیئے۔ ضلع عثمان آباد کے ایک موضع نانج پر جو شولا پور کی سرحد پر واقع ہے ہندوستان کے ایک ہزار مسلح سپاہیوں نے توپوں، ٹینکوں اور ہوائی جہازوں سے حملہ کیا ـــــ اُن کے مقابلہ پر صرف چھ سرفروش تھے جن کے پاس اسٹن گن اور رائفل کے سوا کچھ نہیں تھا۔ آٹھ گھنٹے مقابلہ جاری رہا۔ مجاہدین نے کشتوں کے پشتے لگا دیئے اور آخری کارتوس تک لڑتے ہوئے شہید ہو گئے! ہندوستانی جانی نقصانات کے صحیح اعداد نہیں مل سکے، لیکن خانگی اطلاعات سے پتہ چلا کہ دو سو پچاس سپاہی وہیں مارے گئے اور ساڑھے تین سو کو شولا پور کے ہسپتال میں رجوع کیا گیا ـــــ اس کے بعد مواضعات افضل پور اور کوداڑ میں بھی ایسے ہی واقعات رونما ہوئے اور جب سردار پٹیل اور پنڈت نہرو جنگ کی دھمکیاں دینے لگے اور حیدر آباد کے لئے خطرہ شدید ہو گیا تو ۲۱۔ اگست ۱۹۴۸ء کو سلامتی کونسل میں انڈیا یونین کے خلاف مقدمہ پیش کیا گیا، اور اس امر کی خواہش کی گئی کہ مجلس اقوام متحدہ کی نگرانی میں استصواب رائے عامہ کے ذریعہ حیدر آباد کے مستقبل کو متعین کیا جائے۔

جنگ

ہندوستانی ریاستوں بالخصوص جوناگڑھ پر انڈیا یونین کے ناجائز قبضہ کے خلاف دنیا نے کوئی احتجاج نہیں کیا اور اس وجہ سے حکومت ہند کو یقین ہوگیا کہ بغیر کسی بیرونی مداخلت کے حیدرآباد پر بھی آسانی سے قبضہ ہو جائے گا۔ نظام نے بار بار پنڈت نہرو کے احساسِ نصفت سے اپیل کی اور معاہدۂ انتظام جاریہ کی شرائط کے مطابق نزاعی امور کو سپردِ ثالثی کرنے کی خواہش کی۔ اُس نے اپنے قدیم حلیف شاہِ انگلستان کو جو ہندوستانی قلمرو کا بھی بادشاہ تھا متوجہ کرنا چاہا مگر کہیں شنوائی نہ ہوئی اور اس لئے اُس نے بدرجۂ مجبوری مجلس اقوام متحدہ میں درخواست پیش کی۔ لیکن قبل اس کے کہ مجلس اقوام کوئی قدم اُٹھاتی ہندوستان نے سارے مسائل کو تشدد سے حل کرنے کا تہیہ کر لیا۔ بین الاقوامی صورتِ حال اُس کے لئے سازگار تھی۔ مغربی ممالک جو سوویٹ روس کی بڑھتی ہوئی طاقت کی روک تھام کے لئے ہندوستان کی مدد حاصل کرنا چاہتے تھے اُس کو کسی قیمت پر ناراض کرنے آمادہ نہیں تھے۔ دوسری طرف اندرونی انتشار اور جنگِ کشمیر نے ہندوستانی اقتصادیات کو بُری طرح متاثر کیا تھا، اور اربابِ کانگریس نے اندازہ لگایا تھا کہ نظام کی دولت اس خسارہ کی تلافی کر سکے گی ـــــ مرزا اسماعیل بھی دہلی پہونچا، مشورے ہوئے اور انڈیا کے گورنر جنرل نے نظام کو لکھا کہ سر مرزا اسماعیل جو حیدرآباد کے اندرونی حالات سے واقف ہے یہ رائے رکھتا ہے کہ بدامنی کو رفع

کرنے کے لئے حیدرآباد میں ہندوستانی فوجوں کی موجودگی ضروری ہے،
اس لئے ہماری فوجوں کو سکندرآباد میں قیام کرنے کی اجازت دی جائے
لائق علی کابینہ نے اس تجویز پر غور کیا، اور نظام نے اس کا جواب یہ دیا
کہ حیدرآباد ایک آزاد اور خود مختار ملک ہے اور کوئی آزاد اور خود مختار
ملک کسی غیر سلطنت کی فوجوں کی موجودگی گوارا نہیں کرسکتا۔ یہ غلط
ہے کہ حیدرآباد میں بدامنی ہے، اور اگر آپ کے استدلال کو مان بھی
لیا جائے تو دہلی کے مسلمانوں کی حفاظت کے لئے مجھے اپنی فوجوں کو
دہلی روانہ کرنے کا حق حاصل ہوجاتا ہے ——— !

اس کے بعد حکومت ہند اپنے مقصد کے حصول کے لئے مناسب
حالات کی منتظر ہی تھی کہ حیدرآباد کی بدقسمتی نے اُسے ایک سنہری
موقع عطا کردیا ——! ۱۲۔ستمبر ۱۹۴۸ء کو قائد اعظم کے انتقال پر آسمان
خون کے آنسو بہا رہا تھا، اور سارا عالم اسلام دردوکرب میں مبتلا تھا کہ
۱۳۔ستمبر ۱۹۴۸ء کی صبح کاذب کو برہمنیت نے سوگوار حیدرآباد کی پیٹھ میں
خنجر گھونپ دیا۔!

سازش اندرونی انتشار، اقتصادی بدحالی اور خصوصاً جنگ
کشمیر کے مدنظر ہندوستان ایک اور محاذ دکن میں
قائم کرنے کے موقف میں نہیں تھا۔ اس کو اپنی کمزوری کا احساس تھا
اور اسی سبب سے معاہدہ انتظام جاریہ پر دستخط کرنے کے لئے وہ مجبور
ہوگیا تھا —— لیکن میر جعفر اور میر صادق کی کس دور میں کمی ہے؟ ان

کی روح العیدروس[1] اور زین یار جنگ[2] کے جسم میں سرایت کر گئی، سازش کا ایک جال پھیلا، وعدے ہوئے اور —— پھر کیا ہوا؟ ——

پھر یہ ہوا کہ پٹیل کی فوجیں حیدرآباد کی حدود میں داخل ہو گئیں ——!

حیدرآباد کے حربی مُوقف کے متعلق عیدروس نے لائق علی کابینہ کو یقین دلایا تھا کہ چھ ماہ تک ہندوستانی فوجوں کی کامیاب مزاحمت کی جا سکتی ہے۔ لیکن اُس کی فوجیں پیچھے ہی ہٹتی چلی گئیں اور نہتے مسلمانوں کو دبابوں اور جنگی طیاروں کے مقابلے کے لئے چھوڑ دیا گیا!

نقشۂ جنگ چھوٹے بڑے بائیس محاذ قائم کئے گئے۔ جن میں سب سے بڑا محاذ نلدرگ ضلع عثمان آباد کا تھا جہاں سے یونین کی سب سے بڑی فوج گزر رہی تھی۔ نلدرگ ایک پہاڑی علاقہ ہے جہاں ہماری فوج نے محفوظ مورچے بنا لئے تھے۔ وہاں دو پہاڑوں کے درمیان ایک دریا گزرتا ہے جس کو عبور کرنے کے لئے اُس پر ایک پُل بنایا گیا ہے جو شولاپور کی سمت سے حیدرآباد میں داخل ہونے کے لئے واحد راستہ ہے۔ اس پل پر دو مہینے قبل ڈائنامیٹ نصب کئے گئے تھے جس کو عیدروس نے حملہ سے تین روز پہلے نکلوا لیا۔

---

[1] العیدروس افواج حیدرآباد کا سپہ سالار تھا۔

[2] زین یار جنگ دہلی میں حیدرآباد کا ایجنٹ جنرل تھا۔ اُس کی مشتبہ حرکات کے مدنظر حملہ سے کچھ روز قبل اُسے علٰحدہ کر دیا گیا تھا لیکن وہ اپنی خرابی صحت کے بہانے سے وہیں مقیم رہا۔ آجکل حیدرآباد کی کابینہ میں وہ موجود ہے۔

اگر اس پل ہی کو اُڑا دیا جاتا تو کم از کم دو ہفتے یونین کی فوج آگے نہیں بڑھ سکتی تھی!

صرف ضلع عثمان[1] آباد ہی میں سات محاذ تھے۔ مستقر ضلع کی حفاظت کے لئے عیدروس نے ایک پلاٹون متعین کیا تھا جس کے نزدیک تین ہلکی مشین گنیں اور ہر سپاہی کے پاس صرف دس کارتوس تھے۔ مجلس ضلع میں دو ہزار کارتوس موجود تھے جن میں سے ڈیڑھ ہزار ان سپاہیوں میں تقسیم کئے گئے اور مابقی رضاکاروں کو دیئے گئے۔ مستقر سے سات میل پر دوسرا بڑا حملہ ہوا تھا اور یونین کے دبابے تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ رضاکاروں اور پٹھانوں کو اُن کے مقابلہ کے لئے روانہ کیا گیا۔ جنھوں نے شام کے چار بجے تک یونین کی فوج کو ایک مقام پر روک دیا۔ اُنھیں کوئی مدد نہیں بھیجی جاسکی۔ اس لئے کارتوس ختم ہونے پر وہ لوٹ آئے، اور اُن کے پیچھے پیچھے یونین کے دبابوں نے آکر ایک میل کے فاصلہ سے آبادی پر گولے برسانا شروع کئے۔ اُس وقت وزیراعظم کا لاسلکی پیام پہونچا جس میں مزاحمت جاری رکھنے کی ہدایت کی گئی! ہم نے میجر محسن سے صورت حال کے متعلق مشورہ کیا۔ اُنھوں نے کہا کہ اب شام ہو رہی ہے، تھوڑی دیر مزاحمت جاری رکھی جائے تو رات ہونے پر دشمن آبادی میں داخل نہ ہوگا۔

[1] عثمان آباد دُور افتادہ پہاڑی علاقہ ہے جس کو صرف سڑک کے ذریعہ شہر حیدرآباد سے ملایا گیا ہے۔

اور ممکن ہے کہ صبح ہونے تک حیدرآباد سے امدادی دستے پہونچ جائیں۔ چنانچہ طے ہوا کہ شاہراہ پر ہماری فوج مقابلہ کرے گی جہاں اُس نے مورچے بنا لئے تھے اور عقبی جانب سے ہم دشمن پر آتشباری کریں گے۔ پروگرام کے مطابق ہم اپنی مقررہ جگہ روانہ ہو گئے لیکن اچانک ہماری فوج کی فائرنگ بند ہوتے ہی دشمن کے دستوں نے آگے بڑھکر ہماری رسد کا سلسلہ منقطع کر دیا، اور ہمارے لئے شہر میں داخل ہونا محال ہو گیا۔ ہمارا دوسرا بڑا مورچہ ضلع کی مشرقی سمت میں مَردوڈ پر واقع تھا ہم وہاں سے مدد حاصل کرنے کے لئے پیچھے ہٹ گئے اور رات بھر چل کر مَردوڈ پہونچے۔ لیکن وہاں کے ذمہ دار افسر نے بتایا کہ آگے بڑھنے سے اُس کو منع کر دیا گیا ہے! —— رات کو عیدروس نے اس فوج کو بیدر تک ہٹ آنے کا حکم دیا، حالانکہ اُس وقت تک کوئی حملہ اُس مورچہ پر نہیں ہوا تھا!

نلدرگ کے محاذ پر ہماری فوج کے پاس تین عدد پچیس پاؤنڈ توپیں اور پانچ گولے تھے! عیدروس نے ۱۲۔ستمبر کو کیپٹن وحید الدین اور میجر ذکاراللہ کے سوائے تمام افسروں کو واپس بلا لیا تھا۔ شولاپور سے آنے والی فوج خانہ پور کے سرحدی ناکہ کے مٹھی بھر سپاہیوں کا صفایا کرتے ہوئے طلوع آفتاب سے قبل نلدرگ پہونچ گئی۔ میجر نے پانچوں گولے دشمن کی طرف پھینکے اور جب تمام کارتوس ختم ہو گئے اور سپاہیوں کا شیرازہ بکھر گیا تو اُس نے ہتھیار رکھدیئے۔ نلدرگ کے مورچہ کی

امداد کے لئے تمور پر ایک بڑی فوج اور اسلحہ کا بہت بڑا ذخیرہ رکھا گیا تھا۔ لیکن اس ساری فوج کو عیدروس نے واپسی کا حکم دیا۔۔۔۔
رضاکار بھرمار بنادیق اور برچھوں سے حملہ آور فوج کا مقابلہ کرتے رہے اور یونین کے دبابے اُنھیں کچلتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے!
شمال میں اورنگ آباد، جالنہ اور مہنگولی پر دشمن کا قبضہ ہو گیا۔ لیکن رضاکاروں نے شدید معرکوں کے بعد جالنہ اور مہنگولی کا دوبارہ قبضہ حاصل کیا، اور اُس وقت تک اپنی حفاظت کرتے رہے جب تک کہ گولی بارود کا ذخیرہ ختم نہ ہو گیا۔
جنوب میں ضلع رائچور پر ہاسپیٹ کی طرف سے پیدل سپاہیوں نے حملہ کیا، مقابلہ برابر کا تھا جو کئی روز جاری رہا۔
مشرق میں نارکٹ پلی کے محاذ پر خونریز جنگ جاری رہی۔ شہر حیدرآباد سے قربت کے باعث کثیر تعداد میں رضاکار اس محاذ پر پہونچے اور اُنھیں کافی اسلحہ فراہم ہوتا رہا۔ مجاہد اعظم کے جگر گوشے کاظم رضوی اور آصف رضوی بھی وہاں لڑ رہے تھے! آخر وقت تک دشمن کو اس محاذ پر روک دیا گیا۔
عالم پور کے قریب رضاکاروں نے دریائے کرشنا کا پل اُڑا دیا۔ اور ہندوستانی فوج کی راہ میں مزاحمت پیدا کی۔
دیگر چھوٹے محاذوں سے رسل و رسائل کے ذرائع منقطع ہو چکے تھے۔ مقامی رضاکار ہر جگہ لڑتے رہے اور اپنے خون کا آخری قطرہ

تک بہاتے رہے۔

شجاعت اور پامردی جب ہندوستانی فوجوں کا سیلاب ہمناباد سے گزر گیا اور عیدروس کے سپاہیوں سے کوئی اُمید باقی نہ رہی تو رضا کاروں نے اپنی تمام توانائیوں کو مرتکز کر کے دشمن کا مقابلہ شروع کیا۔ اُن میں سے دو فیصد کے پاس رائفلیں تھیں، پانچ فی صد کے پاس بھرمار بندوقیں اور باقی تمام رضا کار برچھوں، لٹھوں اور کلہاڑوں سے لڑ رہے تھے! ——

اور ان کا مقابلہ ایک ایسی تربیت یافتہ اور تجربہ کار بڑی فوج سے تھا جو نہ صرف تعداد میں اُن سے بیس گُنا زیادہ تھی بلکہ عصری آلاتِ حرب سے مسلح تھی، اور جس کی امداد کے لئے بہترین دبابے، توپ خانے، اور ہوائی جہاز بھی موجود تھے۔ معرکہ کا رن پڑا تھا تاریخِ عالم کی انوکھی جنگ ہو رہی تھی۔ ایک طرف ہندوستانی سپاہی دبابوں میں بند ہو کر گولے پھینک رہے تھے، توپ خانے آگ اُگل رہے تھے، اور جنگی طیارے مسلسل بمباری کر رہے تھے اور دوسری طرف اللہ کے نہتے رضا کار "آتشِ نمرود" میں بے خطر کودے جا رہے تھے اور دبابوں کے پہیوں میں گھُس کر اُن کی زنجیروں کو اُتار رہے تھے!

—— یہ سلسلہ دور تک جاری رہا اور کم از کم بیس ہزار رضا کار دبابوں کے نیچے شہید ہو گئے!! اور اسی سبب سے ۱۵ ستمبر کو آل انڈیا ریڈیو نے اعتراف کیا کہ رضا کاروں کی "خطرناک مزاحمت" سے ہندوستانی فوجوں کی

ترقی کی رفتار کم ہو گئی ہے!ــــ

گذشتہ جنگ عظیم میں جاپانیوں کی شجاعت کی داد دی گئی تھی کہ اُن کے دو سپاہیوں نے برطانوی جنگی جہازوں نیپلز اور پرنس آف ویلز کو غرق کرنے کے لئے جانتے بوجھتے اپنی جان دی۔ لیکن دکن کے رضاکاروں نے شجاعت اور پامردی کی جو مثال قائم کی ہے اُس کی نظیر تاریخ عالم میں ملنا دشوار ہے۔ اُنھوں نے اہل جہان پر واضح کر دیا کہ مردِ مومن خطرات سے بالاتر ہو کر حیات و موت کی اضافتوں سے گزر جاتا ہے۔ اس کے نزدیک موت جاودانی زندگی کی تمہید ہے، اور

"حیات، ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں!"

رضاکار جنگ کے میدانوں میں لڑتے رہے ــــ نہتے اور بے وسیلہ! اُنھوں نے اپنی منزل کو حاصل کرنا چاہا، اور اسی منزل کی دشوار گزار راہ میں جس کو اُن کے ذوقِ سفر نے متعین کیا تھا وہ لڑتے ہوئے شہید ہو گئے اور خالقِ عالم کی نگاہ میں زندہ جاوید ہو گئے!!

دکن کی عورتوں نے بھی اپنا حق ادا کیا۔ اُنھوں نے چاند بی بی کے عزم، سلطانہ رضیہ کے جوش و خروش، اور فاطمہ بنت عبداللہ کے سوز کے ساتھ اپنے جوان بیٹوں۔ بھائیوں، شوہروں اور محبوبوں کے جسموں جسموں پر رضاکار وردی سجا کر جنگ کے میدانوں میں بھیجا اور اس مقدس اقرار کے ساتھ کہ شکست کھا کر نہیں لوٹیں گے، فتح یاب ہوں گے یا راہِ حق میں جان دیدیں گے ــــ! اور پھر اپنی عصمت اور آبرو کے تحفظ کے

لئے فاطمہ کی اَن گنت بیٹیاں باؤلیوں اور کنوؤں میں کود گئیں یا زہر کھا کر مر گئیں !!____

رضاکاروں نے مسلمانانِ عالم سے کیا ہوا وعدہ پورا کیا۔ اُنھوں نے اپنے قائد کی زبان کی لاج رکھ لی!

"ہم تمہارے بھائی ہیں، اُسی رسول کی اُمت ہیں، خالد اور طارق کی اولاد ہیں ____ اُن کے دامن پر دھبّہ نہیں آنے دیں گے! اپنی موت تک آزادی کو باقی رکھیں گے۔"

(خطبۂ صدارت بابت ۱۹۴۸ء)

اُنھوں نے طارق اور خالد کے دامن پر دھبّہ نہیں آنے دیا۔ وہ میدانِ جنگ سے نہیں لوٹے۔ اُنھوں نے خدا کے ساتھ باندھے ہوئے پیمانِ وفا کو پورا کیا اور اُس قیمت پر پورا کیا، جس کے بعد اُن کے ذمہ کچھ اور باقی نہ رہا، اور وہ توحیدِ الٰہی کے حق سے سبکدوش ہو گئے ____! ان کی جنگ کے صحیح خط و خال دنیا کے سامنے نہیں آئے ہیں۔ درحقیقت تاریخِ اسلام کے اہم ترین باب نے سرزمینِ دکن پر خود کو دُہرایا ہے۔ وہی غربت ہے اور اُسی عزمِ مصمم کی ایک کہانی ہے، وہی بے سروسامانی ہے، اور اُسی بے سروسامانی میں جان پر کھیل جانے کی ایک ایسی داستان ہے کہ جس کا تصوّر ہی زمین میں زلزلہ ڈال دے۔ پہاڑوں کو لرزہ براندام کر دے۔ آسمانوں سے خون برسانے لگے! یہ داستان کیا ہے دراصل اُسی داستانِ حرم کا ایک باب ہے جس کی ابتداء

اسماعیل (علیہ السلام) سے اور حسینؓ پر جس کی انتہا ہوتی ہے اور جس کے اطراف تاریخ اسلام ابد تک گھومتی رہے گی!

خاتمۂ جنگ

مردوڈ اور لاتور کی فوجوں نے آود گیر کے راستے بیدر پہنچکر کمپ کیا، اور اس کے بعد مسلسل وہ پیچھے ہٹتی چلی گئیں۔ عیدروس کے لاسلکی پیامات سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ نارکٹ پلی کے محاذ پر یونین نے بڑی فوج جھونک دی ہے جس کے مقابلہ کے لئے مغربی محاذ سے ہماری فوجوں کو بلایا جا رہا ہے۔ ۱۵ ستمبر کو یہ فوجیں سکندر آباد میں داخل ہوئیں، اور ۱۶۔ ستمبر کی شام کو میں دارالسلام پہنچا —— مجاہد اعظم کو عیدروس نے ٹیلیفون پر بتایا کہ اکثر محاذوں پر ہماری فوج کا صفایا ہو گیا ہے اور اب اُس کے پاس صرف پانچ ہزار سپاہی رہ گئے ہیں جو شہر کی حفاظت کے لئے بھی ناکافی ہیں۔ قاسم رضوی صورتِ حال سے ناواقف تھے اور دوسرے روز دارالسلام میں رضاکاروں کے لئے رسد کا انتظام کر رہے تھے کہ کے۔ ایم۔ منشی اور سوامی رامانند تیرتھ کو شاہی محل میں بلایا گیا۔ قاسم رضوی اس وقت کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اُن کے سارے رضاکار باہر تھے اور یونین کی فوج شہر سے صرف چھتیس میل پر رہ گئی تھی۔ کے۔ ایم منشی نے سبز باغ دکھائے اور نظام کو باور کرایا کہ وہ اپنی پسند کی کابینہ تشکیل دے سکتے ہیں۔ ان حالات میں کابینہ کا اجلاس ہوا اور عیدروس نے ہتھیار رکھدینے کی تجویز پیش کی جو منظور ہو گئی —— ! لائق علی کابینہ

نے اپنا استعفےٰ پیش کر دیا۔

مجاہدِ اعظم نے آخری مرتبہ ریڈیو سے قوم کو پیام دیا —— سارا شہر ریڈیو کے اطراف جمع ہو گیا، اُن کی آواز بھرّائی ہوئی تھی:۔

"آزاد دکن کے آزاد باشندو!

میں آزاد حیدرآباد کے آزاد ریڈیو سے آخری بار آپ کو مخاطب کر رہا ہوں۔ آپ ایک سال تک آزادی کی زندگی بخش چھاؤں میں آزادانہ زندگی سے ہم آغوش تھے۔ مگر آج کے بعد یعنی کل آپ کی زندگی میں ایک انقلاب آئے گا!"

شہریوں کی آہ و بکا میں مجاہدِ اعظم کی آواز گم ہو گئی۔ آنے والا "کل" بیکراں اندھیرے کی وحشتناکیوں سے جھانکنے لگا —— کل تک اللہ اکبر کے نعرے سے فضائیں روشن تھیں لیکن "کل" کی گھناؤنی تاریکیوں میں "جے ہند" "سردار پٹیل کی جے" کے نعرے گونج رہے تھے! ——

پھر نظام نے حکومت ہند کے سرکاری کاغذ پر لکھی ہوئی تقریر نشر کی:۔

"پچھلے چند مہینوں میں قاسم رضوی کا ہٹلری ہتھکنڈوں سے میری ریاست پر قبضہ ہو گیا تھا........ اس لئے میں نے ہندوستان کی فوجی امداد طلب کی........ قاسم رضوی کی ہٹلریت کو ختم کرنے کے لئے۔ اب میں نئی وزارت بنا رہا ہوں۔ ولیعہد صدرِ اعظم ہوں گے اور زین یار جنگ، ابوالحسن سید علی، اور پنڈت راما چاری بھی اس وزارت میں شامل ہوں گے۔"

اور اُن رضاکاروں کی روحیں جو ذوقِ شہادت میں ہندوستانی ٹینکوں کے نیچے گھس کر زنجیروں کو اُتار لیتے تھے، بکتر بند گاڑیوں کے سامنے لیٹ جاتے تھے "آزاد حیدر آباد" کے ریڈیو اسٹیشن پر منڈلا رہی تھیں اور اُن کی نعشوں کو روندتی ہوئی ہندوستان کی "فورس آف لبریشن" حیدر آباد کی طرف بڑھ رہی تھی۔!

عیدروس نے میجر جنرل چودھری کے آگے ہتھیار رکھدینے کی رسم ادا کی۔ دین[۱] یار جنگ اُن کے ساتھ تھے ــــ شاہ عثمان "اپنی پسند" کی نئی وزارت کی تشکیل کا متوقع اور اپنی "پیاری ہندو رعایا" سے "شاہ عثمان زندہ باد" کا نعرہ سننے کا منتظر تھا ــــ لیکن جب اُس کی آنکھ کھلی تو فوجی حکومت قائم تھی "تختِ آصفی" پہ میجر جنرل چودھری متمکن تھا۔ اور "شاہ عثمان مردہ باد" کے نعروں سے "کنگ کوٹھی مبارک" کے درو دیوار ہل رہے تھے!

مجاہدِ اعظم کی گرفتاری

مجاہدِ اعظم کو روپوش ہونے یا طیارہ کے ذریعے پاکستان چلے آنے کا پُورا موقع حاصل تھا، وقت نازک تھا۔ جاں بازوں کے قدم ڈگمگا رہے تھے، اور یونین کے بھوت کے گھناؤنے سایہ میں سارا حیدر آباد ڈوب چکا تھا! ــــ جاں نثاروں نے اصرار کیا کہ مجاہدِ اعظم حیدر آباد سے نکل جائیں، لائق علی کابینہ کے اراکین اور مجلس کے قائدین نے منتیں کیں، اور چاہنے والے پاؤں پر گر پڑے۔ لیکن آزادیِ دکن کا یہ ہیرو چٹان کی طرح اپنی

[۱] کمشنر پولیس تھے جن پر ساری قوم کو اعتماد تھا۔ لیکن کے۔ ایم۔ منشی نے انھیں بھی سازش میں شریک کر لیا تھا۔

جگہ قائم رہا۔ اُن کی حمیت نے گوارا نہیں کیا کہ قوم کو کس مپرسی کے عالم میں ٹھوکریں کھانے کے لئے چھوڑ دے۔ اُنھوں نے اعلان کیا کہ قوم پر آنے والی ہر مصیبت کو تنہا برداشت کریں گے۔ اور فلکِ کج رفتار سے نازل ہونے والی ہر بلا کے لئے سینہ سپر ہوں گے!

مجاہد اعظم کی گرفتاری تک میں اُن کے ساتھ تھا۔ ۱۸ ستمبر کو مسلمانوں کے غمگین قافلے اپنے قائد کو دیکھنے کے لئے دارالسلام کی طرف آتے اور جاتے رہے ــــ مجاہد اعظم کی پیشانی پر کوئی بل نہیں تھا، وہ آنے والی مشکلات کے لئے تیار تھے۔ مصیبتوں کے مقابلہ کا عزم اُن کے چہرہ سے عیاں تھا ــــ مجلس کے قائدین روتے ہوئے آئے لیکن مجاہد اعظم کی استقامت اور اُن کے صبر و ضبط سے اُن کے حوصلے بحال ہو گئے ــــ!

"ہم اِس روز کے لئے تیار تھے۔ جب آزادی کا نعرہ لگایا تھا۔ سیاسی زندگی پھولوں کی سیج نہیں ہوتی۔ سیاست میں تخت ہوتا ہے یا تختہ۔ اور دونوں کے لئے ہم تیار تھے"!ــــ

مجاہد اعظم نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ اتنے میں عبدالرحمٰن رئیس نے ٹیلیفون پر حال دریافت کیا، مجاہد اعظم نے کہا:

"I am in high spirits, Rais!"

شام ہو رہی تھی۔ انور منزل سے بچوں نے ٹیلیفون کیا۔ مجاہد اعظم نے ہر بچے سے ہنس ہنس کر باتیں کیں ــــ اور

"رضیہ! تم میری بیٹی ہو نا؟ میری بیٹی کو رونا نہیں چاہیئے۔

ہنسو ـــ ہنسو ـــ میری بیٹی ـــ ہنسو ـــ مجھے تم بُلاتی ہو تو میں ابھی آتا ہوں۔"

مجلس ضلع پربھنی کے صدر جلیل احمد خاں، اور ہم چھ آدمی اُس رات مجاہد اعظم کے پاس تھے۔ آل انڈیا ریڈیو نے اپنی روایات کے مطابق ایک اور خبر نشر کی کہ " قاسم رضوی فرار ہو گئے ہیں "۔ ہم نے مجاہد اعظم کی طرف دیکھا اور وہ مسکرا دیئے۔ پھر پاکستان ریڈیو نے بھی اعلان کیا کہ قاسم رضوی روپوش ہو گئے ہیں۔" ہم نے اس اعلان کو معنی خیز سمجھا اور مجاہد اعظم سے کہا کہ اب یہاں سے چل نکلیئے۔ ہم اپنے دل کے اندر آپ کو رکھکر سرحد کے اُس پار پہنچا دیں گے۔ لیکن مجاہد اعظم نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے جواب دیا:

" میری روپوشی سے حیدرآباد پر قیامت آئیگی۔ درندوں کے انتقام کی آگ بھڑک اُٹھے گی۔ کوئی جوان بچ نہیں سکے گا ـــ اور جانتے ہو عورتوں کا کیا حال ہو گا؟ مجھے بزدل کیوں بناتے ہو؟ انڈیا یونین مجھے قتل ہی تو کردے گا ـــ اور کیا بگاڑلے گا میرا؟"

بے نور چاندنی میں دیر تک ہم دارالسلام کے صحن میں بیٹھے رہے مجاہد اعظم سے بیسیوں سوالات کئے اور اُنھوں نے نہایت شگفتگی کے ساتھ صورتِ حالات سے ہمیں آگاہ کیا ـــ اُنھوں نے کیا کہا؟ اس پر ابھی نقاب پڑی رہنے دیجئے۔ ایک وقت آئے گا جبکہ زمانہ کے ہاتھ اس نقاب کو اُلٹ دیں گے اور دُنیا حقیقتِ مستورہ کو دیکھ لے گی!

تقریباً ایک بجے مجاہدِ اعظم سو گئے اور صبح پانچ بجے بیدار ہوئے۔ ابھی وضو کر ہی رہے تھے کہ پولیس کی لاری اُن کی گرفتاری کے لئے آ گئی۔ سپرنٹنڈنٹ سے ہم نے گفتگو کی۔ ہم نے اُس سے کہا کہ صدورِ مجالسِ اضلاع کی گرفتاری بھی آپ کو مقصود ہو گی۔ لیجئے ہم پربھنی اور عثمان آباد کے صدور آپ کے سامنے موجود ہیں۔ ہمیں بھی گرفتار کر لیجئے۔ لیکن اُس نے جواب دیا کہ فی الوقت صرف مجاہدِ اعظم کی گرفتاری کا حکم ہے ہم نے اندر جا کر پولیس کی آمد کی اطلاع کی۔ مجاہد اعظم نے رضاکار لباس زیب تن کیا۔ نمازِ فجر ادا کی۔ دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے اور کہنے لگے

"میرے رب! تجھ سے کیا مانگوں؟ —— اھدنا الصراط المستقیم —— اور بس!"

ہماری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ سپرنٹنڈنٹ کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ مجاہد اعظم نے قرآن مجید حمائل کیا، سب کو گلے لگایا، اور مومن کے استقلال اور مجاہد کی شان کے ساتھ مُسکراتے ہوئے موٹر میں سوار ہو گئے!

باب ہشتم

وحشت و بربریت

درندگی

انڈیا یونین کے حملہ کے دوران میں بھی جب کہ مسلمانوں کا غم و غصہ انتہا کو پہنچ گیا تھا حیدرآباد میں کوئی ہندو مسلم فساد تو کیا کسی ایک ہندو کے جسم پر خراش تک نہیں آئی۔ سوامی رامانند تیرتھ نے بھی ۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ء کو حیدرآباد ریڈیو سے تقریر کرتے ہوئے اس حقیقت کا اعتراف کیا تھا۔ لیکن فوجی قبضہ کے بعد انڈیا یونین کی غیر مذہبی حکومت کے زیر سایہ مسلمانانِ دکن پر جو مظالم ہوئے ہیں ان کی داستان طویل اور درد انگیز ہے اضلاع کے مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا انھیں چونے کی بھٹی میں ڈالا گیا، دیواروں میں زندہ چن دیا گیا، ان کی جائدادیں لوٹ لی گئیں اور ایسے مظالم ڈھائے گئے کہ جن کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، مسلمانوں نے اس ساری درندگی کو صبر کے ساتھ برداشت کیا۔ بعض مقامات کی اطلاعات سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو آبادیوں کے باہر قطار میں کھڑا کیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ اگر جے ہند، سردار پٹیل کی جے، اسلام مردہ باد اور پاکستان مردہ باد کے نعرے لگائے جائیں تو

ان کی جاں بخشی کی جائے گی لیکن ایمان والوں[1] نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ہم اپنے ایمان کو اس نوبت پر بھی خراب نہیں کریں گے اور اس کے بعد کلمۂ طیب پڑھتے ہوئے وہ شہید ہو گئے! — اس خونریزی کے بارے میں ہندوستان کے لئے پنڈت سندر لال سے زیادہ قابلِ اعتبار شاہد کا ملنا دشوار ہے جنھیں خیر سگالی وفد کے صدر کی حیثیت سے حکومتِ ہند نے روانہ کیا تھا۔ انھوں نے جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے کہا:-

> "طریقۂ کار یہ تھا کہ ہندوستانی فوج آگے بڑھتی جاتی اور اس کے پیچھے کانگریسی غنڈے ہر موضع پر حملہ کر دیتے۔ بالغوں کو پہلے قتل کیا جاتا، پھر عورتوں کی عصمت دری کی جاتی اور اس کے بعد زیورات، نقد، فرنیچر، غلّہ، جانور اور جائداد کی عام غارتگری ہوتی ...... میں نے بے چھت کے مکانات دیکھے، عورتیں دیکھیں جنھیں بیوہ کیا گیا، بچے دیکھے جو یتیم کر دیئے گئے ...... میں نے مواضعات کے کنوؤں کو عورتوں کی نعشوں سے بھرا ہوا دیکھا میں نے ایک ایک موضع کا دورہ کیا لیکن تباہی کے سوا کچھ نظر نہ آیا ..... شام کے وقت میں نے ہاتھ اٹھا کر اپنے خدا سے پوچھا کہ کیا تو نے مجھے نعشوں کا شمار کرنے کیلئے بھیجا ہے[2]؟"

---

(۱) اس سلسلہ میں ضلع عثمان آباد کے قائدین غلام دستگیر صاحب، زین العابدین صاحب اور عبدالرشید رضوی صاحب کے نام کبھی بھلائے نہیں جا سکتے۔

(۲) سندر لال کی اس تقریر کے بعد حیات النساء بیگم صاحبہ صدر مجلسِ اتحاد المسلمات (باقی صـ)

سر ظفر اللہ وزیر خارجہ پاکستان نے سلامتی کونسل میں مقدمۂ حیدر آباد پر بحث کرتے ہوئے ایک واقعہ کے متعلق کہا:-

"میدک میں ہندوستانی فوجیں کلکٹر کاظم جنگ کے بنگلہ میں گھس گئیں کلکٹر اور دیگر دو عہدہ داروں سے اسلحہ چھین لیا اور ان پر گولی چلائی۔ دوسرے عہدہ دار وہیں فوت ہوئے اور کاظم جنگ کے ہاتھ میں گولی لگی۔"

آنجہانی مسز سروجنی نائیڈو گورنر یوپی کے بڑے لڑکے ڈاکٹر جے سوریہ نائیڈو کے بیان کے حوالہ سے ۲۴ ردسمبر ۱۹۴۸ء کو روزنامہ ڈان نے لکھا:-

"کانگریس کے ایک وفد نے جو دو ہندوؤں اور ایک مسلمان پر مشتمل ہے اور جس نے تین روز کے عرصہ میں تین سو ساٹھ میل کا سفر طے کیا ہے رپورٹ کی ہے کہ بجز موضع سالکپور کے ضلع نلگنڈہ میں ایک مسلمان بھی نظر نہیں آسکا۔"

ایک ممتاز کانگریسی لیڈر مسٹر نرسنگ راؤ ایڈیٹر روزنامہ رعیت نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے:-

"میرے ہندو بھائیوں نے پندرہ روز کے عرصے میں کئی گنا زیادہ

(بقیہ صہ) ضلع عثمان آباد سے سوامی رامانند تیرتھ نے کہا کہ آپ کو ہر قسم کی سہولت دی جائے گی آپ کے شوہر مسٹر یعقوب حسینی کو (جو ناظم عدالت تھے اور جنھیں فوجی حکومت نے معطل کر دیا تھا) بحال کر دیا جائے گا بشرطیکہ ضلع عثمان آباد کا دورہ کر کے آپ یہ رپورٹ دیں کہ اس علاقہ میں بالکل امن ہے، کوئی جانی یا مالی نقصان نہیں ہوا، کسی عورت کی عصمت دری نہیں کی گئی اور یہ کہ سندر لال کا بیان غلط ہے۔ بیچارے سوامی جی کو شاید معلوم نہیں تھا کہ مصیبت میں بھی رضاکار خاتون سے ضمیر فروشی کی توقع عبث ہے!

ایسے مظالم ڈھائے ہیں جن کے پندرہ مہینوں میں رضا کار مرتکب نہ ہوسکے .... ہم بہت المناک دور سے گزر رہے ہیں ہماری مسرتیں بیواؤں، یتیموں اور کمزوروں کی آہ و بکا میں گم ہوگئی ہیں میں نے اکثر مقامات ایسے دیکھے ہیں جہاں بجز عورتوں اور بچوں کے ایک بھی مسلمان نظر نہیں آسکتا ــــ مسلمانوں کو مواضعات میں زراعت سے اور شہروں میں سرکاری ملازمتوں سے آپ محروم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر پینتیس لاکھ کی اقلیت کو ذرائع معاش سے محروم کردیا جائے تو کیا اکثریت ایک رات بھی امن کے ساتھ گزار سکتی ہے؟"

آنجہانی مسز سروجنی نائیڈو کی ایک صاحبزادی مس پدمجا نائیڈو نے جو بھارتی پارلیمنٹ کی رکن ہیں ۴؍ اپریل ۱۹۵۱ء کو پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے حکومتِ ہند کی مذمت کی کہ اُس نے حیدرآباد کے نظمِ ونسق کو تباہ کردیا ہے انھوں نے بتایا کہ بےشمار مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں سے ہٹا کر بے روزگار کردیا گیا ہے اور تباہ حال بیواؤں اور یتیموں کی آبادکاری کو نظرانداز کرکے عورتوں کو عصمت فروشی اور بچوں کو گداگری پر مجبور کردیا گیا ہے۔"

حیدرآباد کی سوشلسٹ جماعت نے جو اعداد و شمار فراہم کئے ہیں اُن سے ظاہر ہے کہ حیدرآباد میں ساڑھے تین لاکھ مسلمان تہہ تیغ کردیے گئے لیکن دیگر ذرائع سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آٹھ لاکھ مسلمان قتل کئے گئے اور دو ارب روپیہ مالیت کی جائداد لوٹ لی گئی۔ فوجی افسروں کی امداد سے بےشمار مساجد کو منادر

میں تبدیل کیا گیا، قرآنی نسخوں کو چاک چاک اور متعدد مسلمانوں کو شدھی کیا گیا ــــ سرکاری خزانوں سے عرب گارڈ ہٹا دیے گئے اور سرکاری اطلاعات کے مطابق آٹھ لاکھ مسلمان بے سرو سامانی کے عالم میں ہجرت پر مجبور ہو گئے۔ مسلمانوں کو اُن کی بچی کھچی جائداد کے استعمال سے منع کیا گیا۔ اور نا قابلِ فہم الزامات تراش کر انکو سرکاری تحویل میں لے لیا گیا۔

جنگی قیدی[1] رضاکاروں کے ساتھ ہندوستانی فوج کا بہیمانہ سلوک انسانیت کے دامن پر ایک بدنما داغ ہے۔ حملہ سے کچھ عرصہ قبل رضاکاروں کو فوج میں شامل کر لیا گیا تھا، جو باقاعدہ سپاہیوں کی طرح یونیفارم اور ہتھیار استعمال کر رہے تھے، اور قانون بین الاقوام کے تحت ایک سپاہی کے احترام کے مستحق تھے۔ لیکن جہاں انصاف اور انسانیت کا تصور ہی مفقود ہو، وہاں قانون بین الاقوام کا کیا مقام ہو سکتا ہے؟ ــــ ہندوستانی سپاہی سڑکوں اور بازاروں

---

[1] قاضی ابراہیم ہاشمی صدر مجلس تیر ضلع عثمان آباد (جو آج کل انجمن مہاجرین بہاولپور اسٹیٹ کے صدر ہیں) عثمان آباد جیل میں قید تھے۔ اُن کا بیان ہے کہ اُس جیل میں بڈھوں، ضعیفوں، اندھوں اور معذوروں کو بھی ڈال دیا گیا تھا۔ میجر جنرل چودھری دورہ پر آئے تھے۔ اُن سے اِن لوگوں نے فریاد کی اور کہا کہ رضاکار تنظیم میں شامل ہونے کے وہ اہل بھی نہیں تھے۔ اور بلا وجہ اُنھیں جیل میں ڈال کر دیا گیا ہے۔ اس پر جنرل چودھری نے کہا کہ "رضاکار اگر نہیں تھے تو کیا ہوا، رضاکار کے باپ دادا، یا نانا تو ضرور تھے!"

میں اُنھیں گھسیٹتے۔ اُن کے کانوں کو چھید کر تار کے ذریعے پاؤں سے باندھ دیتے، اور جانوروں کی طرح چلنے پر اُنھیں مجبور کرتے، اُن کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال کر اُن کے کپڑوں میں آگ لگا دیتے، اور "دلچسپی" کی خاطر اُن کے مختلف اعضاء کاٹ لیتے یا اُن کے گولی مار دیتے! —

اور جو فوجی قید خانے (Concentration Camps) اُن کی حراست کے لیے قائم کیے گئے تھے اُن کی مثال جنگ کی تاریخ میں ملنا دشوار ہے۔ چنگیزی وحشت اُن کو دیکھ کر انگشت بدنداں تھی اور نازی بربریت شرما رہی تھی! — ان کیمپوں میں قیدیوں کو دن میں ایک مرتبہ جوار کی روٹی کے ساتھ گھاس اور پتوں کا سالن دیا جاتا اور کھانا ختم ہونے تک یونین کے سپاہی کوڑے برساتے رہتے۔ اُنھیں بیٹھ کر رفع حاجت کی اجازت نہیں تھی بلکہ دوڑتے ہوئے سب کچھ کر لینا پڑتا۔ دن میں دو مرتبہ اُن کی "پریڈ" ہوتی۔ یعنی خاردار تاروں کی کئی باڑوں میں سے دوڑتے ہوئے گزر جانا پڑتا، اور پس و پیش کرنے والے کے جسم کو رائفل کے کُندے سے چُور چُور کر دیا جاتا۔ دن بھر زمین کھودنا اور پتھر ڈھونا پڑتا، اور رات کو زیرِ سماں ایک کمبل میں گزارنا ہوتا۔ اور جب بیمار ہوتے تو طبی امداد بھی اُنھیں فراہم نہ کی جاتی! ان صدمات سے ہزاروں نوجوان فوت ہوئے اور ہزاروں کی صحت تباہ ہو گئی — اور یہ سب کچھ اہنسا کے پرستاروں کی غیر مذہبی حکومت کے نمائندے میجر جنرل چودھری کی قیام گاہ سے دو میل کے اندر ہو رہا تھا!

نظام ہندوستان کی "فورس آف برلیشن" نے نظام کو نظر بند کر لیا اور ملٹری گورنر میجر جنرل چودھری نے اُس کے سارے اختیارات سلب کر لیئے۔ ایک پریس کانفرنس میں اُس نے بتایا کہ نظام کو بغیر فوجی حکومت کی اجازت کے ایک مکان بھی خریدنے کا اختیار نہیں ہے، اور نہ عام طور پر لوگوں سے ملنے کی اجازت ہے۔ البتہ خاص صورتوں میں یونین کے اعلیٰ ترین افسروں کی موجودگی میں ملاقات کا انتظام کیا جاتا ہے۔ مصر کے ایک مشہور اخبار نویس احمد عبد الفتح بیان کرتے ہیں کہ:-

> "ہم نے نظام کو قرآن پیش کیا، اُس نے وحشت زدہ آنکھوں سے دیکھا اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اُس کو اُٹھایا، اور جب اطمینان ہو گیا کہ وہ قرآن ہی ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں ہے، تو اُس نے ملٹری گورنر کے ہاتھ میں یہ کہتے ہوئے رکھدیا کہ "یہ مقدس کتاب ہے" اُس نے یہ الفاظ اس طرح ادا کیئے جیسے ملٹری گورنر سے اس تحفہ کو قبول کرنے کی وہ اجازت چاہ رہا ہو۔"

ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ کے ایک مراسلہ مورخہ ۱۴۔ اکتوبر ۱۹۴۹ء میں بتایا گیا ہے کہ:-

> "اگرچیکہ وہ برائے نام بادشاہ ہے لیکن بطور واقعہ ملٹری گورنر میجر جنرل چودھری اس ملک کا حکمران ہے جو نئی دہلی کی ریاستی وزارت کی ہدایات پر عمل کرتا ہے۔ نظام نے اپنی خانگی جائداد

جو آٹھ ہزار مربع میل پر پھیلی ہوئی ہے، اور جس سے سالانہ تین
کروڑ روپیہ کی آمدنی ہوتی ہے "اپنی مرضی" سے ملٹری گورنر
کے حوالے کر دی ہے۔"

نظام کی جائداد منقولہ پر بھی قبضہ کر لیا گیا، سونے اور چاندی کے ذخیرے کو — جو دنیا کا سب سے بڑا ذخیرہ سمجھا جاتا تھا — بمبئی کی مارکیٹ میں فروخت کر دیا گیا۔ اور موروثی جواہرات ریزرو بنک آف انڈیا کو منتقل کر دیئے گئے — علاوہ ان جواہرات کے اس کے سونے اور چاندی کے ذخائر کی قیمت کا اندازہ بائیس ارب روپیہ کیا گیا ہے!

تہذیب و تمدن

سرزمینِ دکن پر انسانی خون کی ارزانی آپ نے دیکھی، لیکن خون کی رنگین چادروں سے گزر کر آپ کی نگاہِ تیز ٹھوس حقائق کو ٹٹولے تو آپ کو ایک لیسی تہذیب و تمدن کی نعش نظر آئے گی۔ جس کو سات سو سال تک مسلمانانِ ہند اپنے خونِ جگر سے سینچتے رہے ہیں۔ مسلمانوں نے دکن میں ایک مخصوص طرزِ زندگی اور طریقۂ فکر کی بنیاد ڈالی، اور سلطنتِ دہلی کے زوال کے بعد مغلیہ تہذیب کے جواہرات کو بھی دکن کے نوادرات میں شامل کر لیا! — علومِ اسلامی کو ترقی دی گئی، مذہبیات کو اعلیٰ تعلیم کا جزو لازمی بنایا گیا، اور جدید علوم و فنون کو جو مغربی زبانوں

کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے ۔ سرزمینِ دکن پر آزاد کر دیا گیا!
جامعۂ عثمانیہ میں انگریزی کو لازمی مضمون کی حیثیت دی گئی ۔ لیکن
قومی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دیا گیا ۔ دار الترجمہ قائم ہوا اور دنیا کے
تمام علوم و فنون کی بہترین کتابوں کا ترجمہ کیا گیا، اور پچیس سال کی
مشقت اور کروڑوں روپیہ کے صرفہ سے اس ادارہ کا معیار اس
قدر بلند ہوا کہ انگلستان کی تمام جامعات نے اس کو تسلیم کر لیا !
لیکن ہندوستانی حکومت نے اِس ساری جانفشانی پر پانی پھیر دیا،
اور جامعۂ عثمانیہ کی تمام خصوصیات کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا ــــ
اُس نے مسلمان سے اُس کی طرز زندگی چھین لی، اُس کو اپنے طریقۂ
فکر سے محروم کر دیا، اُس کے علوم و فنون کو تباہ کیا اور تہذیب
و تمدن کو فنا کے گھاٹ اتار دیا ! ــــ انسانی ترقیات کا یہ ایک
ایسا المیہ ہے کہ اس پر جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے !

غیر مذہبی حکومت کی برکتیں

حیدر آباد پر یونین کے فیصلہ کے بعد تین سال گزر گئے ۔ لیکن ابھی تک
مظالم کا سلسلہ جاری ہے ۔ پاکستان ریڈیو کی اطلاع کے مطابق پنڈت
نہرو نے ۱۵ ۔ ڈسمبر ۱۹۵۱ء کو سکندر آباد میں تقریر کرتے ہوئے حیدر آباد
کے مسلمانوں اور رضا کاروں پر بے انتہا مظالم کا اعتراف کیا ۔ لیکن
اُن سے پوچھا جائے کہ جور و ستم کے انسداد کے لئے آپ نے کیا

تدبیریں اختیار کی ہیں؟ یہ وحشت و بربریت کب تک جاری رہے گی یہ ظلم و استبداد تا بہ کے؟ کب تک خدا کی زمین کو شیطانی غرور سے ناپاک رکھا جائے گا، کب تک انصاف ظلم سے اور روشنی تاریکی سے مغلوب رہے گی؟ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ آج بھی دکن کی ندیاں مسلمانوں کے خون سے رنگین ہیں۔ آبادیوں اور جنگلوں میں خون کے جمے ہوئے ٹکڑے موجود ہیں۔ شہدائے دکن کی بیکس و بےبس بہنیں اور بیٹیاں آج بھی غنڈوں کی ہوسناکیوں کا شکار ہیں۔ بلبلاتے ہوئے بچوں کی آہ و بکا سے آج بھی فضائیں معمور ہیں بیواؤں کی آہیں آج بھی عرش اعظم سے ٹکرا رہی ہیں اور ـــــ اُن نعشوں کا شمار کون کرے جو دکن کے چپّہ چپّہ میں بےگور و کفن پڑی ہوئی ہیں! ـــــ یہ تمام وحشت و بربریت آپ کے عدل و انصاف کی رحمتیں اور یہ ساری بہیمیت و درندگی آپ کی غیر مذہبی حکومت کی برکتیں ہیں!!

مجلس اقوام متحدہ سطحِ مرتفع دکن پر اسپین کا ڈرامہ کھیلا جارہا ہے۔ اور مجلس اقوام متحدہ ایک خاموش تماشائی کی طرح بیٹھی ہوئی ہے۔ ۲۱۔ اگست ۱۹۴۸ء کو حیدرآباد کا مقدمہ سلامتی کونسل میں پیش کیا گیا۔ ۱۶۔ستمبر ۱۹۴۸ء کو اجلاس پیرس میں اس مقدمہ کو انڈیا کی سخت مخالفت کے باوجود ایجنڈے پر لیا گیا، اور ۲۰۔ ستمبر کو بحث سماعت ہونے ہی والی تھی کہ ۱۷ ستمبر کو

کو حیدر آباد کی فوجوں نے ہتھیار رکھدیئے، اور ہندوستان کے نمایندے نے نظام کے مقدمہ سے دست برداری کی درخواست سلامتی کونسل میں پیش کی۔ لیکن اراکین میں بدگمانی پیدا ہوئی، امریکہ کے نمایندہ ڈاکٹر جیسپ نے بیان کیا کہ طاقت کا استعمال حیدر آباد کے قانونی حق کو متاثر نہیں کر سکتا۔ اور کولمبیا۔ کناڈا۔ اور شام کے نمایندوں نے اس بیان کی تائید کی۔ مجلس کی ۳۶۰ ویں میقات میں ارجنٹائن کے نمایندہ نے کہا کہ جبکہ بھارت نے اپنے جرم کا اقبال کرلیا ہے تو اس کے سوا اب کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ اُسے فوجوں کے انخلاء پر مجبور کیا جائے! ——— اس کے بعد مقدمہ کی سماعت عذراتِ لنگ سے ملتوی کی جاتی رہی۔ لیکن سر محمد ظفر اللہ کے شدید تقاضہ پر سلامتی کونسل نے ۲۹۔ مئی ۱۹۴۹ء کو اس مسئلہ پر اُن کی بحث سماعت کی۔ اُنھوں نے دو دن تک تقریر کرتے ہوئے واقعات کا انکشاف کیا۔ لیکن جب اُن کی تقریر ختم ہوئی تو اجلاس پر خاموشی طاری تھی، گویا کہ سانپ سونگھ گیا تھا! ———

حیدر آباد کا مقدمہ ابھی تک سلامتی کونسل کے ایجنڈے پر موجود ہے اقوامِ مغرب دھڑا بندیوں میں مصروف ہیں، اُنھیں صرف اپنا مفاد عزیز ہے، اور اُن کے نزدیک انسانیت اور انصاف کی قدریں بدل گئی ہیں!! اسی سبب سے نہ صرف حیدر آباد کا معاملہ پسِ پشت ڈال دیا گیا ہے، بلکہ مسئلہ کشمیر کو بھی طوالت دی جا رہی ہے ———

سلامتی کونسل دراصل لیگ آف نیشنز League of Nations کی طرح مفاد پرستوں کی جماعت ہوگئی ہے، اور علامہ اقبالؒ کی زبان میں اس کے متعلق صرف اتنا کہدینا کافی ہے:

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

باب نہم ۹

مقدمات

"پولیس ایکشن" کا جواز — اُس بھیڑیئے کی طرح جس نے نہر کے بہاؤ کے نیچے پانی پینے والے بکری کے بچے کو مورد الزام کیا تھا، ہر استعماریت اپنے جارحانہ اقدام کو ہمیشہ "پولیس ایکشن" سے تعبیر کرتی ہے۔ اور اس اخلاقی اصطلاح کے پردے میں اپنی جوعِ ارضی کو تسکین پہنچاتی ہے۔ انڈونیشیا میں ڈچ حکومت نے "پولیس ایکشن" ہی کیا تھا، اور مراقش میں فرانسیسی حکومت باربار "پولیس ایکشن" ہی کرتی آئی ہے! ——— اور انہی مغربی استعماریتوں کے نقشِ قدم پر ہندوستان نے بھی حیدرآباد میں اپنے باقاعدہ فوجی حملہ کو "پولیس ایکشن" ہی کا نام دیا ہے!! لیکن اس کے بعد اُس کے لئے ایک بڑا مشکل سوال پیدا ہوگیا۔ اُس کو دنیا کے سامنے اپنی اس کارروائی کا سبب اور جواز پیش کرنا تھا۔ چنانچہ مجاہد اعظم کی گرفتاری کے بعد

اُس نے بے بنیاد الزامات میں عام گرفتاریاں شروع کیں۔ چالیس ہزار ملازمین سرکار اور بے شمار مسلم عوام کو جیل میں بھر دیا گیا، اور ایک عرصہ کے بعد ان پر مقدمات کا سلسلہ شروع ہوا۔ ملزمین کو پیروی اور جوابدہی کے حق سے محروم کیا گیا، اور یک طرفہ شہادتوں پر کٹھ پتلی عدالتوں نے اُنھیں سنگین سزائیں دیں! آج بھی ہزاروں مسلمان سزا یافتہ یا زیر تحقیقات ملزمین کی حیثیت سے جیلوں میں سڑ رہے ہیں ——

مجاہد اعظم کی قید

۱۹۔ستمبر ۱۹۴۸ء کی صبح مجاہد اعظم کو گرفتار کر کے حیدرآباد کی خفیہ پولیس کے ہیڈ کوارٹر حویلی قدیم لے جایا گیا، اور شام کے چار بجے حیدرآباد فوج کے حوالے کیا گیا جس نے اُنھیں شام کے چھ بجے تک عثمان ساگر گسٹ ہوز میں رکھکر ہندوستانی فوج کے سپرد کر دیا۔ ملٹری حکومت نے اُنھیں زنجیروں میں جکڑ کر ترملگری جیل کے ایک تاریک کمرہ میں اکیس ۲۱ دن مقید رکھا۔ اور اس عرصہ میں اُنھیں بڑی عقوبتیں پہنچائیں۔ رات کو اُنھیں ایک کمبل دیا جاتا جس میں گھوکرو کے کانٹے لگے رہتے، اور صبح یہ کمبل واپس لے لیا جاتا تاکہ یہ کانٹے نکالے نہ جاسکیں۔ دن میں ایک مرتبہ کمرہ کا دروازہ کھولا دیا جاتا اور منھ ہاتھ دھونے کے لئے انھیں ایک حوض پر لے جایا جاتا جس میں بارش کا گندہ پانی جمع ہو گیا تھا۔ ا

اس طرح اکیس دن گزر جانے کے بعد ایک بند موٹر میں مجاہد اعظم کو حکیم مپیٹھ کی طیران گاہ لے جاکر فوجی طیارہ میں پونہ بھیجدیا گیا۔ جہاں اُنھیں

تقریباً چھ ماہ رکھا گیا۔ بند اور تاریک کمروں کی قید، خراب غذا اور مسلسل جسمانی تکالیف سے اُن کی صحت خراب ہو گئی اور اپنڈکس کے شدید درد سے بخار آنے لگا۔ ڈاکٹروں نے آپریشن کا مشورہ دیا۔ لیکن وہ راضی نہ ہوئے اور جب اُن کی حالت نازک ہو گئی تو میجر جنرل چودھری نے اُن کی بڑی صاحبزادی اور چھوٹے بھائی کو اُن کے پاس روانہ کیا ــــ اِس وقت تک کسی کو علم نہیں تھا کہ مجاہد اعظم کہاں ہیں۔ اُن کی صاحبزادی نے بھی آپریشن کے لئے اصرار کیا، لیکن اُنھوں نے کہا کہ موت کا ایک دن مقرر ہے۔ اگر میری موت قریب آ گئی ہے تو آپریشن مجھے نہیں بچا سکیگا ورنہ بغیر آپریشن کے بھی میں زندہ رہوں گا۔ بہر حال علاج کے دوسرے طریقے اختیار کئے گئے جن سے وہ رو بہ صحت ہو گئے۔

غالباً مارچ ۱۹۴۹ء میں مجاہد اعظم کو حیدر آباد لے جا کر ترملگری کے قلعہ میں رکھا گیا، وہاں اُن کی صحت پھر خراب ہو گئی، اور ڈاکٹروں نے کہا کہ بغیر آپریشن کے کوئی علاج کارگر نہیں ہو سکتا۔ حیدر آباد کے چند با اثر اشخاص نے اُنھیں مجبور کیا اور ایک مشہور سرجن ڈاکٹر بہادر خاں کی موجودگی میں کسی فوجی سرجن نے اُن کا آپریشن کیا۔ ۲۶۔ جولائی کو اُنھیں ترملگری کے اسپشل جیل میں منتقل کیا گیا اور اُسی روز مقدمہ قتل شعیب اللہ خاں کے دوسرے ملزمین منعم خاں اور محسن رضا کو بھی اس جیل میں داخل کیا گیا۔ ۲۷۔ جولائی ۱۹۴۹ء کی صبح اُنھیں پہلی مرتبہ عدالت خصوصی میں پیش کیا گیا۔ ۱۱۔ ستمبر ۱۹۵۰ء کو مقدمات قتل

شعیب اللہ خاں اور ڈکیتی بی بی نگر میں سزائے حبس دوام دی گئی اور ۲۷۔اکتوبر ۱۹۵۰ء کی صبح پانچ بجکر ۲۵ منٹ پر سنٹرل جیل چنچل گوڑہ کی ایک بند کوٹھری میں اُنھیں منتقل کر دیا گیا۔ جہاں وہ آج تک ایک مظلوم اور مقہور قیدی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

ذیل میں ایک مبصر کا مکتوب درج ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سزایاب "ملزم" کا دنیا کی نگاہوں میں کیا مقام ہے :-

حیدر آباد دکن

۱۹۔ستمبر ۱۹۵۱ء

آج عدالت عالیہ میں رضوی صاحب کی جانب سے پیش کردہ درخواست تحقیر عدالت Contemp of Court کی پیشی تھی۔ رضوی صاحب اصالتاً بحث فرمانے والے تھے۔ چنانچہ سوا دس بجے رضوی صاحب عدالت العالیہ لائے گئے، حسب معمولی گارڈ ساتھ تھا۔ ساڑھے دس بجے سے اجلاس شروع ہوا۔ ایڈوکیٹ جنرل نے چند معمولی قسم کے ابتدائی عذرات کئے جن کی کوئی اہمیت نہیں، لیکن اس بہانہ وہ پیشی تبدیل کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ کتاب کے مصنف اور ناشر کی طرف سے گوپال راؤ اکبوٹے نے پیروی کی۔ اُنھوں نے بھی معمولی قسم کے ابتدائی عذر کئے۔ خود رضوی صاحب نے ایک بڑا دلچسپ ابتدائی عذر کیا۔ اُنھوں نے پوچھا کہ میرے مقابل جو کھڑے ہیں ڈایڈوکیٹ جنرل ہیں یا وکیلِ سرکار۔ اگر وکیل سرکار ہیں تو وہ بالکل اپنی جگہ کھڑے رہیں،

اور صدر المہام تعلیمات اور ناظمِ تعلیمات وغیرہ کی طرف سے پیروی کر سکتے ہیں، اور مجھے کچھ کہنا نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ ایڈوکیٹ جنرل کی حیثیت سے کھڑے ہیں تو پھر اُن کی جگہ میرے بازو ہے۔ ایڈوکیٹ جنرل کا فرض ہے کہ عدالت کے وقار اور عدالت کی عزت کی حفاظت کریں، اس لئے انھیں میری درخواست کی تائید کرنی چاہیئے نہ کہ اس درخواست کی مخالفت۔ ایڈوکیٹ جنرل دم بخود کھڑا رہگیا اور عدالت میں خاموشی طاری رہی۔ معمولی سے مباحث کے بعد پیشی دوشنبہ ۲۴-ستمبر تک کے لئے ملتوی ہوگئی۔ قریب ایک بجے رضوی صاحب واپس لیجائے گئے۔

یہ تو وہ روئیداد ہے جو شاید آپ اخباروں میں بھی پڑھ لیں گے اب اس کا دوسرا رُخ بھی ملاحظہ کیجئے:۔

رضوی صاحب زیرِ دریافت قیدی بھی ہیں اور سزایاب قیدی بھی وہ قیدی کے لباس میں رہتے ہیں، اجلاسِ عدالت، صحن سٹرک آدمیوں سے پٹی پڑی تھی۔ خصوصاً واپسی کے وقت ایک اژدہام ہوگیا گارڈ کو رضوی صاحب کو اور اُن کی موٹر کو اپنے گھیرے میں لے کر سوار کرنا پڑا؛ لوگ ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے کہ رضوی کی ایک جھلک دیکھ لیں۔

واپسی کے وقت میں اُوپر کی منزل پر کھڑا دیکھتا رہا، نیچے رضوی صاحب اپنی موٹر میں سوار ہو رہے تھے۔ مقدمہ کے نظائر اور دیگر دستاویزات تو میرے ساتھ تھے۔ متعلقہ امثلہ وغیرہ رضوی صاحب

کے ساتھ تھیں اور تقریب ایک بالشت اونچا بنڈل تھا جسے وہ تسموں سے باندھ لائے تھے۔ اس تسمہ میں وہ اپنا رومال ڈال کر اپنے کندھے پر ڈال لئے تھے اور رومال کے کونے اپنے ہتھکڑی پہنے ہوئے ہاتھوں سے تھامے گارڈ کے درمیان ننگے پیر بڑی شان سے چلے جارہے تھے۔

سیرے باز و کھڑے ہوئے بعض حضرات دلچسپی سے ہنستے ہوئے تماشہ بھی دیکھ رہے تھے، لیکن بعض کی آنکھوں میں آنسو بھی چھلک رہے تھے، اور میں اس ملے جلے مجمع میں کھڑا ایک اور منظر دیکھ رہا تھا "پولیس ایکشن" سے تین چار مہینے پیشتر رضوی صاحب آخری مرتبہ ہائیکورٹ آئے تھے اُس کے بعد آج آنا ہوا تھا۔ اُس دن بھی تین سال پیشتر بھی میں نے سب سے پیچھے کھڑے رہ کر یہ منظر — رضوی صاحب کی آمد اور روانگی — دیکھی تھی۔ رضوی صاحب اس رخ سے نہیں آئے تھے جدھر سے حکام عدالت اور دوسرے اعلیٰ عہدہ دار آتے ہیں۔ رضوی صاحب قریب قریب سب سے آخر میں آئے تھے۔ عوامی وزراد بھی آچکے تھے اور ہائیکورٹ کے سالانہ رنچ کے شروع کرنے میں صرف رضوی صاحب کا انتظار تھا۔ رضوی صاحب کی جیپ ویگن آئی۔ رضوی صاحب کے اے۔ ڈی۔ سی اُترے، رضاکار یونیفارم میں ریوالور لٹکائے ہوئے اور اُن کے پیچھے رضوی صاحب جناح کیپ لگائے ہوئے سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ میر مجلس عدالت عالیہ نے آگے بڑھکر اُن کا استقبال کیا۔ ہائیکورٹ

کے ججس (حکام) نے تعظیماً سلام کیا (جن میں قمر حسن۔ سری نواس چاری اور وٹھل راؤ دیس پانڈے بھی شامل تھے۔ جنھیں آج اجلاس پہ رضوی صاحب کو تعظیماً سلام کرنا پڑا) لنچ ہوا تقریریں ہوئیں۔ تصویر لی گئی اور مہمانوں کی واپسی شروع ہوئی۔ سٹیر ھیوں کے پاس سب سے پہلے رضوی صاحب کی موٹر آئی اور اُسی شان سے رضوی صاحب واپس تشریف لے گئے۔

مجمع میں پیچھے کھڑے ان آنکھوں سے میں نے وہ بھی منظر دیکھا تھا۔ نہ کوئی ہنس رہا تھا نہ کسی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ لیکن اُس دن میری آنکھوں میں رضوی کی وہ عزت نہیں تھی جو آج ہے!"

مجاہد اعظم پر الزامات

مجاہد اعظم کا اگر کوئی قصور تھا تو صرف یہ کہ وہ اپنے ملک کی آزادی کے لئے لڑتے رہے لیکن اپنی آزادی کی حفاظت کے لئے لڑنا دنیا کے کسی قانون میں جرم نہیں ہے، اور اس بنا پر اُن کے خلاف کوئی مقدمہ سرسبز نہیں ہوسکتا تھا۔ تاہم "پولیس ایکشن" کے جواز کی خاطر اُن پر الزامات عائد کر کے مقدمات کا چلایا جانا حکومت ہند کے لئے نہایت ضروری تھا۔ چنانچہ اس غرض سے اُس کے کارندے نہایت سرگرمی کے ساتھ دوڑ دھوپ کرتے رہے۔ اُنھوں نے جعلی شہادتیں فراہم کیں، اور دیگر ملزمین کو سخت ترین اذیتیں پہنچا کر اُن سے بیانات دلوائے اور بالآخر جون ۱۹۴۹ء میں دو چالانات مجاہد اعظم کے خلاف فوجی حکومت

کی قائم کردہ عدالتِ خصوصی میں پیش کیے[1] جس کا قیام قانوناً ناجائز اور دستوراً غلط تھا۔ اُن پر دو الزامات تھے، ایک شبیب اللہ خاں کے قتل کی اعانت، اور دوسرا موضع بی بی نگر میں ڈکیتی کی اعانت کا تھا۔

مجاہدِ اعظم کی گرفتاری کے ایک طویل عرصہ یعنی گیارہ ماہ بعد ان مقدمات کا آغاز ہوا۔ اُن کی جانب سے پیروی کے لئے ہر وکیل کی درخواست مضحکہ خیز عذرات سے نامنظور کر دی گئی۔ سر عبدالرحمٰن کو پیروی سے اس لئے منع کیا گیا کہ وہ پاکستانی ہیں۔ اور مدراس کے ایک ایڈوکیٹ وینکٹا چاری اور لندن کے بیرسٹر جی۔ڈی۔ رابرٹس کو اس لئے اجازت نہیں دی گئی کہ وہ اُردو سے ناواقف ہیں۔ حالانکہ ساری عدالتی کارروائی انگریزی زبان ہی میں ہو رہی تھی! نیز یہ امر انتہائی حیرت انگیز ہے کہ صفائی کے گواہوں کے بیانات کے لئے مجاہدِ اعظم کی ہر درخواست نامنظور کر دی گئی! —— البتہ فوجی حکومت نے اپنی پسند کے ایک وکیل کو اُن کی جانب سے پیروی کے لئے مقرر کیا۔ جس کا وکالت نامہ اُنھوں نے آگے چلکر منسوخ کر دیا، اور آخر تک اصالتاً پیروی کرتے رہے۔

---

[1] ملزم منعم خاں کو پندرہ روز تک ممکنہ جسمانی عقوبتیں دی گئیں۔ لیکن اس پر بھی وہ پولیس کے حسبِ منشا بیان دینے پر راضی نہ ہوئے، تو ان کی ماں اور بہن کو اُن کے سامنے لاکر پیٹا گیا۔ منعم خاں اس روحانی تکلیف کو برداشت نہ کر سکے۔ اور پولیس کی خواہش کے مطابق بیان دینے کے لئے آمادہ ہو گئے۔

مقدمہ قتل شعیب اللہ ہندوستانی پولیس کے چالان کا مختصر مضمون یہ ہے کہ شعیب اللہ خاں مدیر امروز (دکن) مجاہد اعظم کا سیاسی مخالف تھا اور اُن کے خلاف پروپاگنڈا کرتا تھا۔ اس وجہ سے اُنھوں نے اُس کو قتل کرا دیا۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ "امروز" اتنا غیر معروف اخبار تھا کہ اس کے کسی پروپیگنڈے سے مجاہدِ اعظم کا خائف ہونا بعید از قیاس تھا نیز اس کے علاوہ اس سے کہیں زیادہ تعداد میں شائع ہونے والے چند اخبارات اُن پر سخت تنقید کیا کرتے تھے اور اُن کے لیے بہت آسان تھا کہ ان اخبارات کو بند کرا دیتے یا سنسر کے ذریعہ ان پر پابندی عائد کر دیتے۔ لیکن چونکہ وہ آزادیِ صحافت کے حامی تھے اس لئے وہ ایسا کرنا سخت ناپسند کرتے تھے۔

استغاثہ کی جانب سے ایک گواہ قدیر اللہ نامی بھی پیش ہوا جس نے بیان کیا کہ وہ مجاہد اعظم کا قدیم ساتھی اور اُن کے اعتماد کا حامل تھا، اور یہ کہ اُنھوں نے اُس کو شعیب اللہ کی جاسوسی کے لئے مقرر کیا تھا، اور اُس کے قتل کے بارے میں اُس سے مشورہ کیا تھا۔ اس بیان کو اہمیت دیتے ہوئے عدالتِ خصوصی نے اُنھیں سزائے حبسِ دوام سنائی۔ مگر مرافعہ میں ہائیکورٹ نے اُن کے وکیل میکنا کے مسلسل اصرار پر پولیس ڈائری طلب کی تو اس میں دو خطوط پائے گئے جو شعیب اللہ نے قدیر اللہ کو لکھے تھے اور جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا

کہ قدیر اللہ ایک زمانہ میں شعیب اللہ کا اُستاد تھا اور شعیب اللہ نے اس کو مجاہدِ اعظم کی جاسوسی اور قتل کے لئے مقرر کیا تھا۔ پہلے خط میں جو ۵۔مئی ۱۹۴۸ئہ کو لکھا گیا تھا شعیب اللہ نے قدیر اللہ کو ہدایت کی تھی کہ وہ مجاہد اعظم سے ملاقات کرنے کی کوشش کرے۔ رضا کار تنظیم میں شریک ہو اور مواضعات کا دورہ کر کے زیادہ سے زیادہ بدامنی پیدا کرے تاکہ رضا کار تنظیم بدنام ہو جائے۔ دوسرے خط مؤرخہ ۱۰۔مئی ۱۹۴۸ئہ میں شعیب اللہ نے لکھا کہ کسی حادثہ کے حیلہ سے مجاہد اعظم کو شہر سے دُور لے جائے' اور وہاں اُنھیں تنہا چھوڑ دے تاکہ اُنھیں قتل کیا جا سکے —— اِن خطوط سے اس حقیقت کا انکشاف ہو گیا کہ مجاہد اعظم نے شعیب اللہ کا قتل نہیں کرایا بلکہ خود شعیب اللہ اُن کے قتل کی سازشیں کر رہا تھا۔

دورانِ سماعت میں جسٹس نائک نے متاثر ہو کر کہا:

"یہ ایسا بد ترین مقدمہ ہے کہ جس کی بے بنیادی اور بے ربطی کی مثال مَیں نے عمر بھر نہیں دیکھی۔"

اِن حالات میں مجاہد اعظم کی براُت کے سوا ہائی کورٹ کو کوئی چارہ نہیں تھا۔

مقدمۂ بی بی نگر پولیس کا یہ بیان ہے کہ حیدر آباد پر ہندوستان کے قبضہ سے کچھ عرصہ قبل موضع بی بی نگر میں کچھ ہندوؤں اور دیگر مسلمانوں میں ایک فساد ہوا جس میں مسلمانوں نے

ہندوؤں کو لوٹا اور زخمی کیا، اور اس واقعہ کی اعانت مجاہد اعظم نے کی۔

پولیس نے واقعہ کے روز ہی تفتیش شروع کر دی تھی۔ لیکن باوجود دریافت کے نہ تو ملزمین کے نام بتلائے جا سکے اور نہ اُن کی شناخت کی جا سکی۔ لوٹ کھسوٹ کی کوئی رپورٹ پولیس میں پیش نہیں ہوئی۔ تفتیش کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ حیدرآباد پر انڈیا یونین کا قبضہ ہو گیا، اور ہندوستانی پولیس نے سارا معاملہ اپنے ہاتھ میں لے کر تفتیش شروع کی۔ لیکن مسلسل پانچ ماہ کی کوشش کے بعد بھی وہ کسی شخص پر کوئی ذمہ داری عائد نہ کر سکی۔ چنانچہ ۱۷۔ فروری ۱۹۴۹ء کو اُس نے عدالتِ فوجداری میں مختتم رپورٹ پیش کی اور عدالت نے حسب ذیل الفاظ لکھکر اس مقدمہ کو ختم کیا:

"بہ ذمہ داریِ پولیس کارروائی ختم کرنے کی اجازت دی گئی"

یہ امر بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ اِس وقت تک مجاہد اعظم کا نام اس مقدمہ کے تعلق سے کبھی نہیں لیا گیا۔ لیکن اس کے دو ماہ بعد ہندوستانی حکومت کی ہدایت پر مکرر کارروائی شروع کی گئی اور مجاہد اعظم کا نام ملزمین کی فہرست میں شامل کر دیا گیا۔

ڈکیتی کا کوئی مال برآمد نہیں کیا گیا، اور عدالت نے اس امر کا اعتراف کیا کہ مجاہد اعظم موقعِ واردات پر موجود نہیں تھے بلکہ بہت دیر

بعد اس موضع کو پہونچے، اور مقامِ واقعہ سے کافی فاصلہ پر ٹھہرے رہے!
لیکن چونکہ حکومتِ ہند کو "پولیس ایکشن" کا جواز مقصود تھا اس لیے
اُنھیں سات سال قید با مشقت کی سزا دی گئی — ! اُنھوں نے
سُپریم کورٹ میں مرافعہ پیش کیا ہے، جو ابھی زیرِ تحقیقات ہے!

لائق علی کابینہ کے خلاف مقدمات

ہندوستانی نقطۂ نظر سے دیگر قائدینِ مجلس
اور لائق علی کابینہ کے خلاف بھی مقدمات کا
قائم کرنا ناگزیر تھا۔ ان کا بھی وہی قصور تھا
جو مجاہدِ اعظم کا تھا، یعنی یہ کہ اپنی آزادی کی خاطر وہ حملہ آوروں کا مقابلہ
کرتے رہے۔ لیکن یہ قصور اُنھیں سزایاب کرنے اور رائے عامّہ
کو دھوکہ دینے کے لئے ناکافی تھا۔ اس لئے حسبِ ذیل الزامات اُن
پر اور مجاہدِ اعظم پر عائد کئے گئے۔

(۱) بارہ سو قتل کی وارداتوں کی اعانت

(۲) چار ہزار ڈکیتیوں کی اعانت

(۳) تین ہزار چھ سو آتش زنی کے واقعات کی اعانت۔

(۴) ریاست حیدرآباد سے ہندوؤں کو بھگا کر خالص مسلم ریاست
کے قیام کی کوشش۔

حیدرآباد کی شکست کے ایک سال بعد تک ان "جرائم" کے متعلق
ایک لفظ بھی بیان نہیں کیا گیا۔ اور خاص بات یہ ہے کہ ہندوستان
کی غیر مذہبی حکومت نے لائق علی کابینہ کے ہندو وزراء کو رہا کر دیا۔ حالانکہ

وہ بھی مسلم وزراء کے ساتھ ہر فعل کے لئے برابر کے ذمہ دار تھے۔

حکومت ہند نے "پولیس ایکشن" کے متعلق ایک قرطاس ابیض شائع کیا تھا جس میں تمام "انتشار اور خلفشار" کی ذمہ داری محض نظام پر عائد کی گئی تھی، اور مجاہد اعظم یا لائق علی کابینہ کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں لکھا گیا تھا۔ اس قرطاس ابیض کی روشنی میں مجاہد اعظم نے عدالت سے درخواست کی کہ لائق علی کابینہ نے جو کچھ کیا وہ نظام کی ہدایات کے مطابق تھا۔ اور خود حکومتِ ہند بھی تمام مبیّنہ واقعات کے لئے اُسی کو ذمہ دار قرار دیتی ہے اس لئے اس مقدمہ میں نظام کو ملزم نمبر اول بنا کر تحقیقات کی جائے۔ لیکن عدالت نے اس درخواست کو اس بنا پر نامنظور کر دیا کہ بھارت کے دستور کے تحت راج پرمکھ پر مقدمہ چلایا نہیں جا سکتا۔

یہ مقدمات ابھی زیر تحقیقات ہیں اور معلوم ہوا ہے کہ استغاثہ کی فہرست میں چالیس ہزار گواہوں کے نام درج ہیں![1]

قدرت نے مجاہد اعظم کو ہر مصیبت کے مقابلہ کے لئے تیار کیا

جیل میں

ہے۔ اور اسی سبب سے زندگی کے کٹھن مرحلوں میں بھی اُن کے قدم ڈگمگانے نہیں پائے۔ بزدل دشمن کی اذیتوں کو وہ صبر کے

---

[1] تازہ ترین اطلاعات کے بموجب لائق علی کابینہ کے خلاف مقدمات کو حکومت نے اُٹھا لیا ہے۔

ساتھ برداشت کر رہے ہیں۔ اور ناقابل برداشت تکالیف کے باوجود حرفِ شکایت زبان پر لانا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔

جیل میں اُن سے سخت مشقت لی جاتی ہے، وہ دن بھر زمین کھودتے ہیں، بوجھ ڈھوتے ہیں اور بیماری و جسمانی کمزوری کے باعث بیہوش ہو کر گر جاتے ہیں۔ مگر جب ہوش میں آتے ہیں تو پھر اپنا کام کشادہ پیشانی کے ساتھ شروع کر دیتے ہیں۔

انھیں تہہ خانہ کے ایک تاریک کمرہ میں رکھا گیا ہے اور باوجود پیچش اور متعدد بیماریوں کے اُنھیں جوار کی روٹی اور پپیتے کے پتّے کا سالن دیا جاتا ہے۔ اور کوئی طبّی امداد فراہم نہیں کی جاتی۔ ان وجوہ سے اُن کی صحت خطرناک حد تک گر گئی ہے، اور اُن کے وکیل مسٹر زاہد علی کامل نے ذریعۂ مکتوب مورخہ ۱۹-اکتوبر ۱۹۵۱ء موسومہ سپرنٹنڈنٹ جیل حیدرآباد کے ذمہ دار عہدہ داروں اور پنڈت نہرو کو حالات کی نزاکت سے مطلع کیا ہے۔ واقعات کے انکشاف کے لئے یہ خط ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

"جنابِ من۔ مسٹر سید محمد قاسم رضوی کا میں وکیل ہوں جنھیں آپ کی جیل میں رکھا گیا ہے۔ بیگم قاسم رضوی نے ملزم کی پیروی اور صورتِ حال سے اُنھیں باخبر رکھنے کے لئے مجھے مقرر کیا ہے۔

میرے مؤکل کو بی بی نگر کے مبیّنہ مقدمۂ ڈکیتی میں سات سال کی سزائے قید با مشقت دی گئی ہے۔ جس کا اُنھوں نے سپریم کورٹ

میں مرافعہ پیش کر دیا ہے۔ لائق علی کابینہ کے مقدمہ میں وہ زیر
تحقیقات ملزم ہیں۔ یہ ایک غیر معمولی مقدمہ ہے جس میں بارہ سو
قتل، چار ہزار ڈکیتی اور تین ہزار چھ سو آتش زنی کی وارداتوں
کی اعانت کے الزامات اُن پر عائد کئے گئے ہیں۔ اس مقدمہ
میں وہ اصالتاً پیروی کر رہے ہیں:۔

(۱) مجھے اپنے مؤکل کی صحت کے متعلق بڑی فکر و تشویش ہے۔
پہلے دو مقدمات کی تحقیقات سے قبل اپنڈی سائیٹس کے لئے اُن
کا انتہائی پیچیدہ آپریشن کیا گیا ہے۔

(۲) سزا یابی سے کچھ عرصہ بعد ترملگیری کے محبس خصوصی سے
اُنھیں آپ کی جیل میں منتقل کیا گیا ہے، اور اس کے بعد آج تک
ایک ایسے تہہ خانہ میں رکھا گیا ہے جس میں ہوا اور روشنی کا گذر
نہیں ہے۔ اس تہہ خانہ میں کوئی تندرست انسان بھی بیمار
ہو سکتا ہے۔

(۳) عہدہ دارانِ جیل نے اُن کے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہے اُس کی
مثال صرف قرونِ وسطیٰ کی فرانسیسی ناولوں ہی میں مل سکتی ہے ــــ
اس دوران میں حیدر آباد کے قواعد محبس کے ہر حکم کی خلاف ورزی
کی گئی ہے۔ آپ مجھے معاف کریں اگر میں آپ کو یہ بتاؤں کہ قواعدِ
محبس کے حسب ذیل احکام کی خلاف ورزی کی گئی ہے:۔

۱۔ قاعدہ (۵۹) کے مطابق آپ نے اپنی سرکاری حیثیت میں ملزم کو

دن میں کم از کم ایک مرتبہ نہیں دیکھا

۲ - بمتابعت قاعدہ (۴۲۸) پندرہ دن میں ایک مرتبہ ملزم کا وزن نہیں لیا گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ بتدریج اور مسلسل ملزم کا وزن خطرناک حد تک گھٹ گیا ہے۔ اُن کا وزن بوقت گرفتاری ۱۳۲ پونڈ، آپریشن سے قبل ۸۵ پونڈ، بوقت سزایابی ۱۱۱ پونڈ اور آپ کی جیل میں منتقلی کے بعد ۱۰۰ پونڈ تھا۔ گذشتہ ایک سال کے عرصہ میں صرف دو مرتبہ اُن کا وزن لیا گیا۔

(۳)۔ بلحاظ قاعدہ (۶۵۲) سزایابی کے تین ماہ بعد اُن کی وزنی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں نہیں نکالی گئیں۔

(۴)۔ عدالت نے میرے مؤکل کو قید بامشقت کی سزا دی ہے نہ کہ قیدِ تنہائی کی۔ لیکن قاعدہ (۴۴۴) کے واضح احکام کے مغائر عہدہ داران جیل نے ایک طویل عرصہ سے بغیر کسی وقفہ کے اُنھیں قید تنہائی میں رکھا ہے گویا کہ یہ عہدہ دار عدالتِ انصاف سے بالاتر کوئی چیز ہیں۔ اس طرح میرے مؤکل کی صحت بلکہ زندگی کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔

(۵) اگر ایک سال کی قید تنہائی کا کوئی جواز پیش بھی کیا جائے جس کے متعلق ہمارا دعویٰ ہے کہ ایسا ممکن نہیں تو میں مکرر آپ کی توجہ قاعدہ (۶۶۳) کی طرف مبذول کرتا ہوں، جس کے مندرجۂ ذیل احکام کی خلاف ورزی کی گئی ہے:۔

(الف) آپ ہر روز میرے مؤکل کو نہیں دیکھتے (قاعدہ ۱۹ - اور ۶۶۳)

(ب) ابتدائی چھ مہینوں میں ہر روز ایک گھنٹہ تفریح کی انھیں اجازت نہیں دی گئی (قاعدہ ۴۴۵) اور

(ج) اُنھیں ایک یا زیادہ قیدیوں کے ساتھ کھانے کی اجازت نہ دی گئی نہ دی جاتی ہے۔ (قاعدہ ۴۴۵)

(۶) جو مشقت میرے مؤکل سے لی گئی وہ اُن کی صلاحیت اور جسمانی حالت سے کہیں زیادہ ہے۔ ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کے ساتھ صبح آٹھ بجے سے شام کے چار بجے تک اُن سے کام لیا جاتا ہے۔

(۷) قاعدہ ۵۹ اور ۹۲ کے مطابق مشقت کی مقدار کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔

(۸) میرے مؤکل سے جو مشقت لی گئی، اُس میں ہر روز اضافہ ہی کیا جاتا رہا۔ حالانکہ آپ کو معلوم ہے کہ وہ ایک ایسے غیر معمولی مقدمہ میں اصالتاً پیروی کی تیاری کر رہے ہیں جس کی مثال عدالتی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔

(۹) میرے مؤکل کو جو پیچش اور اپنڈی سائیٹس کے مریض ہیں، جوار راگی۔ ملی اور مکئی کی روٹی اور پپیتے کے پتوں کا سالن دیا جاتا ہے۔ اس غذا کے ساتھ سخت مشقت، قیدِ تنہائی اور تاریک کوٹھری کی زندگی سے میرے مؤکل کو آپ کی جیل میں دو مرتبہ پیچش ہو گئی اُنھیں مناسب اور فوری طبی امداد بھی نہیں دی گئی۔ شدید بیماری کی

حالت میں بھی نا معلوم وجوہ سے سخت مشقت جاری رکھی گئی، جس کے باعث کام کے دوران میں وہ بار بار بیہوش ہوتے گئے، اور ہوش میں آکر محض قوتِ ارادی سے اپنا کام خاموشی سے جاری رکھتے گئے۔ کیونکہ آپ سے عنایات اور مہربانیوں کی درخواست نہیں کرنا چاہتے، اور نہ اس سلسلہ میں کوئی شکایت کرنا چاہتے ہیں۔

(۱۰) قید تنہائی کے دوران میں اپنے مؤکل سے ملاقات کے لئے مجھے گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا تھا۔ یہی ایک ایسا موقع ہوتا تھا جبکہ میرے مؤکل کو تھوڑی دیر کے لئے کھلی ہوا، روشنی اور ایک ہمدرد انسان کی صورت میسّر ہوتی تھی۔ لیکن حالات جب زیادہ خراب ہوگئے تو آپ کے طرزِ عمل کے متعلق ہمیں عدالت کو متوجہ کرنا پڑا۔ جس نے ذریعۂ حکم نشان ۴/۳۶ مؤرخہ ۴ دسمبر ۱۹۵۰ء ہماری ملاقات کی اجازت کے لئے ہدایت صادر فرمائی۔ گذشتہ تین ماہ سے میرے مؤکل کو مسلسل شدید بخار آ رہا ہے اور اُن کا وزن بتدریج کم ہو رہا ہے۔ عہدہ دارانِ جیل اس سے واقف ہیں اور اُنھیں یہ بھی معلوم ہے کہ میرے مؤکل کے پیٹ میں بار بار تکلیف پیدا ہو رہی ہے، اُن کا سر چکرا رہا ہے اور سارے جسم میں مسلسل درد ہو رہا ہے۔ وہ دن بدن زرد پڑتے جا رہے ہیں اور اُن کی حالت ابتر ہو رہی ہے۔ ان حالات میں مجھے اندیشہ ہے،

کہ خاتمہ زیادہ دُور نہیں

مجھے معلوم ہے کہ قیدی کی جان بچانے کے لئے کچھ نہیں کیا جا رہا ہے۔ جہاں تک کہ مجھے علم ہے اور جہاں تک کہ تمام مہذب ممالک کی تاریخ کا تعلق ہے، قید با مشقت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ قیدی کے ساتھ ایسا سلوک کیا جائے جس سے وہ قید خانہ میں فوت ہو جائے۔

غالباً آپ بھول گئے ہیں کہ میرے مؤکل ایک طاقت ور جماعت مجلس اتحاد المسلمین کے صدر تھے بلکہ آج بھی ہیں۔ بحالتِ موجودہ مجلس کا خواہ کچھ مؤقف ہو اور اُس کے صدر کو قیدِ با مشقت کی سزا دی گئی ہو، یہ حقیقت اپنی جگہ باقی ہے کہ وہ ایک معزز خاندان کے ذی حیثیت انسان تھے۔ تمام مسلمانوں کے واحد رہنما تھے جن کی ہر شخص محبت اور عزت کرتا تھا۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ اُنھیں معمولی درجہ سوم میں رکھا گیا ہے، اور چلچلاتی دھوپ میں گھاس کھودنے اور اُٹھا کر گڑھوں میں بھرنے پر مجبور کیا جاتا ہے دوسرے مقامات پر سیاسی قیدیوں کے ساتھ باعزت سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ پولیس نے ایسی دہشت طاری کی ہے کہ میرے مؤکل کے عزیز و اقربا، چاہنے والے، ساتھی اور ہم پیشہ بھائی جیل میں اُن سے ملاقات کی ہمت نہیں کر سکتے۔ صرف مجھے اور دیگر چند مشیروں کو جیل میں اُن سے ملاقات اور اُن کے مصاحب

و تکالیف کے مشاہدہ کا حق دیا گیا ہے۔ میرے مؤکل کو اس قدر نظر انداز کیا گیا ہے کہ اُن کے مشیر قانونی اور عملاً ولی کی حیثیت سے میں اپنا اخلاقی، قانونی اور انسانی فرض سمجھتا ہوں کہ ان اہم واقعات کو اربابِ اقتدار، عدالت ہائے قانون، اُن کے خاندان اور بیرونی دنیا کے سامنے پیش کروں۔ میں نے مناسب خیال کیا کہ پہلی اور آخری مرتبہ آپ سے دریافت کروں کہ کیا آپ میری حسب ذیل تجاویز سے اتفاق کریں گے:-

(الف) مجھے اجازت اور سہولتیں دی جائیں کہ میں اپنے خرچہ سے ماہر ڈاکٹروں کے ذریعہ اپنے مؤکل کا امتحان اور علاج کراؤں!

(ب) اگر ڈاکٹروں کی رائے ہو تو جیل میں یا جیل کے باہر اُن کے ایکس رے فوٹو گراف اور ضرورتاً آپریشن کی اجازت دی جائے۔

(ج) مجھے اجازت دی جائے کہ عہدہ داران جیل کے توسط سے اپنے مؤکل کو دوائیں اور غذا فراہم کروں۔

مجھے توقع ہے کہ آپ ان تجاویز پر فوراً غور کر کے مجھے اطلاع دیں گے کہ اس بارے میں کیا کیا جا سکتا ہے، ورنہ میں سمجھتا ہوں کہ میرے مؤکل کی حالت مؤثر علاج کے لئے سازگار باقی نہ رہے گی، بلکہ خطرناک صورت اختیار کرے گی، خصوصاً اس سبب سے کہ میرے مؤکل اپنی تکالیف کے متعلق ایک لفظ بھی کسی سے نہیں کہیں گے، بلکہ مصائب کو خاموشی اور صبر سے برداشت کرتے چلے جائیں گے۔"

یہ خط ہندوستان اور پاکستان کے متعدد اخباروں میں شائع کیا گیا، اور اس پر اداریے لکھے گئے، اور متعدد سیاسی جماعتوں اور اشخاص نے حکومتِ حیدرآباد اور پنڈت نہرو سے مجاہدِ اعظم اور دیگر سیاسی قیدیوں کی رہائی کی اپیل کی۔

مسٹر مہادیو سنگھ صدر سوشلسٹ پارٹی حیدرآباد اپنے ایک بیان میں کہتے ہیں کہ عثمان علی خاں کو تو راج پرمکھ بنانا اور اُن کے حکم پر کام کرنے والوں پر مقدمہ چلانا انصاف کے منافی ہے۔ اخباروں میں ان مقدمات کی رپورٹ جیسے ہی عوام پڑھتے ہیں اُن کی آنکھوں میں ماضی کا بدنما نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ اس لئے ان مقدمات سے دست بردار ہو کر اور سارے مسلم اسیروں کو رہا کر کے پچھلی کشیدگی کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینا چاہیئے۔" (روزنامہ رہنمائے دکن مورخہ ۱۵۔ڈسمبر ۵۱ء)

صدر اکھل بھارتیہ انجمن پیشوایانِ مذاہب نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ :۔

"اب ملک کے ہندو مسلمان و دیگر مذاہب کے پیرو یہ چاہتے ہیں کہ انتخابات کے موقع پر بلا امتیاز تمام سیاسی قیدیوں کو چھوڑ دیا جائے، اور پولیس کارروائی کے بعد جن جن لوگوں پر مقدمات چلائے جا رہے ہیں، وہ سب اُٹھا لئے جائیں۔"
(روزنامہ رہنمائے دکن مورخہ ۱۵ ڈسمبر ۵۱ء)

صدر حیدرآباد اسٹوڈنٹس فیڈریشن یہ کہتے ہیں کہ :۔

"تمام مجلسی قائدین کی رہائی اور اُن پر سے جملہ سیاسی مقدمات کی برخاستگی کا اعلان کیا جائے تا کہ اقلیتی طبقہ کی بے چینی اور مایوسی دُور ہو سکے۔"

(روزنامہ رہنمائے دکن مؤرخہ ۱۵؍ڈسمبر ۱۹۵۱ء)

ملّا عبدالباسط جو کٹّر کانگریسی ہیں، اور جنھوں نے حیدر آباد پر ہندوستانی فوجوں کے قبضہ سے پہلے انڈیا یونین میں شرکت کا بار بار مطالبہ کیا تھا، اپنے ایک بیان میں کہتے ہیں:۔

"مسلمانوں پر پولیس ایکشن کے بعد جو مقدمات مختلف نوعیت اور عنوانات سے قائم کئے گئے، اور اُن کی ایک کثیر تعداد کو اب تک قید و بند میں رکھا گیا ہے اُن کی رہائی اور مقدمات سے دستبرداری کے مطالبہ میں اپنے آپ کو اُن تمام حضرات سے متفق پاتا ہوں جنھوں نے اس بارے میں خیالات کا اظہار اخبارات کے ذریعہ کیا ہے۔ جبکہ پولیس ایکشن کے بعد، قتل، ڈاکہ اور ہر قسم کے ہزاروں مقدمات کو نظر انداز کر دیا گیا، اور ان کے متعلق کوئی کارروائی نہیں کی گئی، تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اُن مبینہ مقدمات کو بھی جن کا تعلق پولیس ایکشن کے قبل کے زمانہ سے ہے نظر انداز کر دیا جائے۔ کوئی وجہ نہیں نہیں معلوم ہوتی کہ ہندو وزراء کو چھوڑ دیا جائے اور مسلمان وزراء پر مقدمات چلائے جائیں، جبکہ پچھلے واقعات کے متعلق

دونوں کی ذمہ داری یکساں ہے۔"

(روزنامہ رہنمائے دکن مورخہ ۱۵۔ ڈسمبر ۱۹۵۱ء)

حیدرآباد کمیونسٹ پارٹی کے معتمد عمومی کا مطالبہ ہے کہ:۔
" پولیس ایکشن کے بعد کے تمام مسلم اسیروں کو رہا کردیا جائے، اور صدر مجلس اتحاد المسلمین اور دیگر قائدین جن کو سزائیں ہوئی ہیں، اُن کی سزاؤں کو ختم کر کے مقدمۂ وزرار و زیرِ دوران مقدمات سے دست برداری کرلی جائے۔"

(روزنامہ رہنمائے دکن مورخہ ۱۸۔ ڈسمبر ۱۹۵۱ء)

اِسی طرح قوم پرست لیڈر بیرسٹر اکبر علی خاں، ڈاکٹر جیسوریہ اور دیگر متعدد قائدین نے مجاہد اعظم اور مجلسی قائدین کی رہائی کا مطالبہ کیا ہے۔ جمیعۃ العلمائے ہند نے بھی اپنے سالانہ اجلاس (۲۹ مئی ۱۹۵۱ء) میں ان قائدینِ مجلس کی رہائی کے لئے قرارداد منظور کی ہے۔

کراچی سے مؤتمر عالم اسلامی کے معتمد عمومی مسٹر انعام اللہ، کرسچین الیسوسی ایشن کے صدر مسٹر تو بو، پارسی جماعت کے رہنما مسٹر جمشید نصروان جی اور ہندو پنچایت کے صدر نے بھی پنڈت نہرو سے درخواست کی ہے کہ مجاہد اعظم کو رہا کیا جائے ——

اہنسا کے پرچاریوں اور انسانیت کے دعویداروں کے ضمیر سے اپیل کی گئی، لیکن اہل جہان کو آج تک اس کا ردِ عمل معلوم نہ ہوسکا!

حال ہی میں ریاست میں اسمبلی کے افتتاح کے موقعہ پر تمام کمیونسٹ نظر بندوں کو رہا کر دیا گیا ہے۔ اور اس کے پہلے وزراء کو بھی الزامات ثابت نہ کرنے کی وجہ سے رہا کیا گیا ہے۔ اور مقدمات واپس لے لئے گئے ہیں۔ لیکن مجاہد اعظم کو ان کی صحت خراب ہونے کے باوجود ہنوز قید و بند میں رکھا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بھارت کی حکومت مجاہد اعظم کی آزادی کے جذبے کا انتقام لے رہی ہے۔

باب دہم

شخصیت اور خانگی زندگی !

قدو قامت عام تصوّر یہ ہے کہ کسی شخص کے نظریات، اندازِ بیان اور کارنامے، اس کے قدو قامت اور حالتِ جسمانی سے مناسبت رکھتے ہیں ۔۔۔ لیکن مسلمانوں کا وہ قائد جس کی گرج سے آسمان لرز جاتے، دریاؤں کے دل دہل جاتے اور جس کی ہیبت سے پہاڑ سمٹ کر رائی ہو جاتے، کوئی تنومند، دیو ہیکل انسان نہیں بلکہ پانچ فٹ چار انچ قد والا ایک لاغر اور نحیف الجثہ انسان ہے بس ۔۔۔ لیکن اُس کی آنکھوں میں برق کی روشنی ہے۔ ایک چمک ہے نایاب! یہ روشنی اس کی ذہانت کی شاہد ہے اور یہ چمک اس کے پاکیزہ ضمیر کی آئینہ دار! ۔۔۔ اس کی نگاہیں اس کی بے پناہ قوت ارادی کو مخاطب پر مرکوز کر کے اس کو مرعوب اور مسخر کر لیتی ہیں۔ اور یہی وہ خداداد صلاحیت ہے جس نے ہولناک آندھیوں کو سلا دیا تھا۔ اور ہیبت ناک طوفانوں کے

رُخ پھیر دیئے تھے! اُس کے بدترین دشمنوں کو بھی اِس حقیقت کا اعتراف ہے۔ علی یاور جنگ نے اپنے مضمون "حیدر آباد کا پس منظر[1]" میں قاسم رضوی پر تبصرہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اُن کا چہرہ عرب نما اور آنکھیں چمکدار ہیں، اور اُن سے گفتگو کرنے والا ہمیشہ مرعوب ہو جاتا ہے۔ ماؤنٹ بیٹن کے مشیر قانونی کمپبل جانسن نے بھی اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ اس پست قامت انسان سے آنکھیں ملا کر بات کرنا بہت دشوار امر ہے۔

صبح و شام مملکتی مجلس کے صدر منتخب ہونے کے بعد مجاہدِ اعظم کی مصروفیات بے انتہا ہو گئی تھیں۔ کھانے، سونے اُٹھنے بیٹھنے کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا، عام طور پر انھیں رات میں ایک اور دو بجے کے درمیان سونے کا موقع ملتا، اور کبھی رات رات بھر جاگنا پڑتا۔ —— لیکن اس سے قبل اُن کی زندگی نہایت منظم اور مربوط تھی۔ صبح ۵ بجے وہ بیدار ہوتے اور ساڑھے پانچ بجے باتھ روم سے نکل کر پونے چھ بجے تک نمازِ فجر ادا کرتے اور پھر تفریح کے لئے باہر نکل جاتے۔ چھ بجے لوٹ کر ایک انڈا اور ایک پیالی چائے نوش فرماتے (چائے اور سگریٹ کے بہت دلدادہ ہیں، بالخصوص مجلس کے آخری دور میں تو

---

[1] یہ مضمون حیدر آباد کی شکست کے بعد ٹائمز آف انڈیا میں شائع ہوا ہے۔

چائے ہی اُن کی غذا بن گئی تھی۔ چائے میں دودھ بہت کم ڈالتے ہیں، اور خصوصیت یہ ہے کہ چائے کو ٹھنڈا کر کے پیتے ہیں) چائے کے بعد سات بجے تک قرآن مجید کی تلاوت اور کلامِ اقبال کا مطالعہ کرتے اور پھر اپنے آفس میں داخل ہوتے، جہاں پونے دس بجے تک مقدمات کی تیاری کرتے اور وہیں سے عدالت چلے جاتے۔ دوپہر کا کھانا ایک بجے گھر پر کھاتے، عدالت میں دو بجے چائے پیتے۔ چار بجے عدالت سے لوٹ کر حمام کرتے، بچوں کے ساتھ چائے پیتے اور پانچ بجے کلب چلے جاتے، کلب میں ٹینس اور برج کھیلتے اور آٹھ بجے گھر لوٹ آتے۔ ساڑھے آٹھ تک نمازِ عشاء سے فارغ ہوکر نو بجے کھانا ختم کرتے، اور اس کے بعد مجلس کے کام میں لگ جاتے یا اخباروں اور کتابوں کے مطالعہ میں مصروف ہو جاتے ـــــ بارہ بجے تک یہ سلسلہ جاری رہتا

باغِ زندگی کے پھل

مجاہدِ اعظم کو اپنے بچوں سے بے انتہا محبت ہے اور اُن کی خاطر وہ ہر تکلیف کو برداشت کرنے پر تیار رہتے ہیں ـــــ حیدرآباد کی شکست سے کچھ روز قبل ایک سخت آندھی آئی تھی۔ اُس وقت وہ ایک برانڈے میں آرام کر رہے تھے۔ درختوں کی ٹہنیاں ٹوٹ رہی تھیں، مکانات کی چھتیں اُڑ رہی تھیں۔ اُن کی بیوی نے جھپٹ کر اُن کا ہاتھ پکڑا

اور پلنگ سے اُتارا ہی تھا کہ ایک بڑا پتھر اُس پلنگ پر آ پڑا، اور وہ بال بال بچ گئے۔ حالتِ تشویش میں وہ کمرہ کے اندر داخل ہوئے اور بچوں کو پوچھنے لگے۔ اس وقت تک بجلی کے تار ٹوٹ جانے سے اندھیرا ہو گیا تھا۔ اُنھوں نے بچوں کو ایک ایک کرکے اپنے نزدیک بلا لیا۔ لیکن چوتھا لڑکا عارف رضوی موجود نہیں تھا ——— اُن کی آنکھیں پھٹ گئیں، ہونٹ خشک ہو گئے اور وہ ایسی خطرناک حالت میں باہر نکل کر پوری طاقت سے "عارف، عارف!" چلّانے لگے ——— اور اس وقت تک اندر نہیں گئے جب تک کہ برابر والے کمرہ سے نکل کر عارف اُن سے لپٹ نہ گئے۔

دسترخوان پر جب بیٹھتے تو اپنی پلیٹ کی ہر اچھی چیز بچوں کی پلیٹ میں ڈال دیتے، اور نلی سے گُودا نکال کر اپنے ہونٹوں سے اُنھیں کھلاتے ——— بچوں کی تعلیم و تربیت کا اُنھیں بڑا خیال ہے۔ نشانہ اندازی، درخت پر چڑھنا، تیرنا اور موٹر چلانا وہ خود اُنھیں سکھاتے رہے ہیں ——— بچوں کو وہ حکم نہیں دیتے بلکہ بالواسطہ ہر بات سمجھاتے اور اُن میں خود اعتمادی پیدا کرنے کی ہمیشہ کوشش کرتے۔ چنانچہ بڑی لڑکی کو آٹھ سال کی عمر میں لاتور سے گلبرگہ شریف اپنے نانا کے ہاں تنہا ذریعہ ریل روانہ کرتے تھے، اور بڑے لڑکوں کو اسی عمر میں تنہا تفریحی سفر کے لئے بھیجتے تھے ——— لیکن اس تمام شیفتگی پر قوم کا عشق ہمیشہ غالب رہا اور بچوں کی محبت کبھی قومی اُمور

میں مُخل نہ ہو سکی! ۱۹۴۸ء میں مملکتی مجلس کا اجلاس سالانہ قریب آگیا تھا، اور شہر میں اُنھیں خطبۂ صدارت لکھنے کی فرصت نہیں مل رہی تھی، اس لئے وہ عثمان ساگر چلے گئے، جہاں اطلاع ملی کہ اُن کا ایک بچہ ناصر رضوی سخت علیل ہو گیا ہے اور اُنھیں گھر بُلایا جا رہا ہے لیکن اُنھوں نے اپنی بیوی کو لکھا کہ

"میرے آنے سے تمھیں کیا حاصل ہو گا، خدا کو منظور ہے تو بچہ اچھا ہو جائے گا، ورنہ میرے آنے سے بھی کوئی فائدہ نہ ہو گا۔"

انڈیا یونین کے حملہ کے دوران میں اُن کے دو بڑے لڑکے کاظم رضوی اور آصف رضوی نارکٹ پلی کے محاذ پر لڑ رہے تھے۔ ہتھیار رکھدینے کے بعد بچے کھچے رضاکاروں کی واپسی کے لئے کچھ موٹریں روانہ کی گئیں۔ تمام رضاکار اُن میں سوار ہو گئے لیکن کاظم رضوی کو جگہ نہ مل سکی اور اس لئے ۴۳ میل کا سفر اُنھیں پیدل طے کرنا پڑا ——

اس اثنا میں یہ خبر عام ہو گئی کہ کاظم رضوی شہید کر دیئے گئے ہیں! مجاہدِ اعظم کو بھی اس کی اطلاع ملی۔ اُنھوں نے خدا کا شکر ادا کیا اور کہا:

"خداوندا تیرا احسان ہے کہ تو نے اپنی راہ میں میری نذر قبول فرمائی۔"

دوسرے روز کاظم رضوی شہر پہونچے، اور ٹیلیفون پر اپنے باپ سے کہا "بابا! میں آگیا ہوں۔"

"کون؟ کاظم! —— افسوس کہ تم ملت کے کام نہیں آئے!"

"اس کی آرزو ہی رہ گئی بابا!"

مجاہد اعظم کے دس بچے ہیں۔ اُن کی بڑی صاحبزادی سرور سلطانہ رضوی ایم۔بی۔بی۔ایس کے سالِ آخر میں پڑھتی ہیں۔ شعر بھی کہتی ہیں اُردو ادب کا ستھرا مذاق پایا ہے

پونہ جیل میں مجاہد اعظم کی ملاقات کے لئے وہ گئی تھیں، لیکن اپنے باپ کو اُنھیں چھونے کی اجازت نہیں تھی، بلکہ سات فٹ کے فاصلہ سے گفتگو کر سکتی تھیں —— محبت کی بیتابیوں پر یہ بندشش کس قدر انسانیت سوز تھی! اُن کی نگرانی کے لئے ایک بڈھا سکھ سپاہی متعین تھا، جو معلوم ہوتا ہے کہ پہلو میں ایک دردمند دل رکھتا تھا۔ باپ کے احساسات اور بیٹی کے جذبات، انسانیت کی بے بسی، بے چینی اور تڑپ سے بُڈھا متاثر ہوا، اور جب سب جا چکے تو کہنے لگا۔

"بیٹی! اپنے باپ سے ملو گی؟"

"آپ یہ کیوں پوچھتے ہیں؟"

"میری بیٹی! اس لئے کہ میرے سینے میں بھی دل ہے! ملو، میری آرزو ہے کہ اپنے باپ سے ملو!"

(مجاہد اعظم تشویشناک نگاہوں سے اپنی بیٹی کو دیکھ رہے تھے۔)

"لیکن مجھے کیوں ملنا چاہیئے؟"

"میرے دل کی ٹھنڈک کے لئے، میری روح کی فرحت کے لئے!
میری بیٹی ــــ میں اس قابل نہیں کہ تمہیں اپنی بیٹی کہوں ــــ
لیکن ــــ پھر بھی تم سے التجا کرتا ہوں، منّت کرتا ہوں ــــ!"
(اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے)

"سردار جی! بابا سے ملنے کے لئے میرا دل بیتاب ہے۔ لیکن آپ کی اِس رعایت سے فائدہ نہیں اُٹھاؤں گی جس کا آپ کو اختیار نہیں دیا گیا ہے۔"

مجاہد اعظم کے چہرہ پر مسرت کی لہر دوڑ گئی! ــــ

اور بڈھے میجر کی ہچکیاں بندھ گئیں!!

مجاہد اعظم کے دوسرے صاحبزادے سید احمد کاظم رضوی ہیں، حیدرآباد کی فوج میں کیڈٹ ہو گئے تھے۔ پاکستان کے ہوائیہ میں پائلٹ ہیں۔ خوش الحان اور ہاکی و ٹینس کے اچھے کھلاڑی ہیں ــــ مجاہد اعظم کے اُن سے تعلقِ خاطر کا اندازہ اُن کے مکتوب مورخہ ۹۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء سے ہو سکتا ہے جو اُنھوں نے جیل سے لکھا ہے:

۱۱۔ ۹۔ ۵۰ء

پیارے بابو جان! جیو۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔ خطوں میں دیر سویر ہوتی ہے۔ بالکل فکر مت کرو، تم اپنے کام میں لگے رہو محنت کرو، خدا تمہیں محنت کا پھل دے گا۔ تمہاری فکر رہتی ہے دل بیتاب ہو جاتا ہے ــــ مگر میں صبر کروں گا۔ میری بیتابی

دل تمہارے کام میں حائل نہ ہو۔ البتہ ہر پندرھویں دن صرف ایک سطر لکھدیا کرو کہ میں اچھا ہوں، میرے لئے یہی کافی ہے۔ خدا تمھیں اور تمہارے ساتھیوں کو ملک و ملت کی بہترین خدمت کے قابل بنائے اور بے لوث خدمت کی توفیق عطا کرے۔

بابو جانم، تم سے کہنا یہ تھا کہ اپنا خالی وقت بہترین کتابیں اور اخبار بینی میں گزارو، جس قدر ہو سکے پڑھو۔ پڑھو اور پڑھو۔ کچھ پڑھنے کو نہ ہو تو پرانے اخبار پڑھو، مگر پڑھو۔ تم سویرے اُٹھتے ہوگے، یقیناً نماز پڑھتے ہوگے۔ جس وقت بھی اُٹھتے ہو، اُس سے پانچ منٹ پہلے اٹھو اور قرآن شریف کی کم از کم تین آیتیں مع ترجمہ پڑھ لیا کرو۔ خدا تمہارے وقت میں بھی برکت دے گا اور کام میں بھی برکت اور کامیابی دے گا۔ خدا حافظ و ناصر۔ فقط۔ تمہارا بابا

قاسم

تیسرے صاحبزادے سید احمد آصف رضوی ہیں جو ڈی۔ جے کالج میں پڑھتے تھے، اور اب پاکستان کے ہوائیہ میں اُن کا انتخاب ہوگیا ہے۔ سمجھدار، مقطع، نمازی اور پرہیزگار ہیں۔ ٹینس کے شوقین ہیں۔

سید احمد عارف رضوی چوتھے صاحبزادے ہیں، پشاور کالج میں پڑھتے ہیں۔ ترقی پذیر سیاسی رجحانات کے حامل ہیں، مقرر ہیں اور مسائل پر سنجیدہ غور و فکر کے عادی ہیں۔

ذکیہ سلطانہ پانچویں صاحبزادی ہیں، میٹرک کی طالبہ ہیں، خوش مزاج

معاملہ فہم اور دلیر ہیں۔ پتنگ اُڑانا ان کا دلچسپ مشغلہ ہے
رضیہ سلطانہ چھٹے درجہ میں پڑھتی ہیں، اُنھیں پڑھنے لکھنے ہی سے دلچسپی ہے۔

فوزیہ سلطانہ تیسرے درجہ کی طالبہ ہیں، حساس اور غریبوں کی ہمدرد ہیں

طیبہ سلطانہ دوسرے درجہ میں شریک ہیں۔ یہ میری "بڑی آپا" ہیں، اور مجھ سے اکثر شرطیں ہارتی رہتی ہیں۔ شریر ہیں اور تہذیب و تکلفات کا اُنھیں بڑا خیال ہے۔

سید احمد ناصر رضوی پہلے درجہ میں پڑھتے ہیں۔ حلیم الطبع اور سمجھدار ہیں۔

سید احمد فاروق رضوی مجاہد اعظم کے سب سے چھوٹے فرزند ہیں جو اُن کی گرفتاری کے تقریباً دو ماہ بعد انور منزل میں پیدا ہوئے ایک بیباک سپاہی کا جوہر اُن میں ابھی سے نمایاں ہے۔ اکڑ کر بات کرتے ہیں اور اپنی مرضی کو منوانے کی ہمیشہ کوشش کرتے ہیں اپنے "بابا" سے اُنھیں بہت محبت ہے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ مجاہد اعظم کی تصویر دریچہ کی سلاخوں کے پیچھے رکھی ہوئی تھی۔ وہ دوڑتے آئے اور اپنی ماں سے کہنے لگے:

"بابا کی تصویر یہاں سے جلد ہٹاؤ، اس کو جیل میں کیوں رکھا ہے؟"

۱۹۴۵ء



دائیں سے بائیں

سرور سلطانہ رضوی، انکی گود میں ناصر رضوی - مجاھد اعظم، انکی گود میں طیبہ سلطانہ اور رضیہ سلطانہ - ذکیہ سلطانہ - عارف رضوی

پیچھے کی قطار میں:- کاظم رضوی - فوزیہ سلطانہ اور آصف رضوی -

B.A. L.L.B

~~Moha M.A.~~

Mohammad Ali

Rahi of

A.B. Seenia line,

Allahabad,

Shaik Hotel,

Hut No. 442. Karachi,

Pakistan

سید محمد ارشد رضوی مجاہد اعظم کے مرحوم چچا زاد بھائی سید محمد صدیق رضوی کے صاحبزادے ہیں، مجاہد اعظم نے اپنے بچے کی طرح اُن کی پرورش کی ہے۔ اور اکثر لوگ اُنھیں اُن کا فرزند ہی سمجھتے ہیں۔ یہ میٹرک کے طالب علم ہیں۔

شعر و سخن مجاہد اعظم کی شاعرانہ صلاحیتوں سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ ابتدائی زمانہ میں اُنھیں شعر کہنے کی فرصت تھی لیکن بعد میں قومی و ملّی مصروفیتوں کے باعث اُن کی توجہات اس طرف زیادہ منعطف نہ ہو سکیں۔ اُن کا کلام اسلامی فکر کا مرقع اور اُن کے مجاہدانہ کردار کا آئینہ دار رہے۔ اُن کی ایک نظم جو اُنھوں نے زمانۂ طالب علمی میں لکھی ہے، اُن کی ندرتِ فکر کی ایک زندہ مثال ہے۔ یہ نظم کتاب ہذا کے باب دوم میں درج کی گئی ہے:۔

مجاہدِ اعظم خیر و شر کو لازم و ملزوم سمجھتے ہیں، اور وجودِ شر کو انسانی کردار کی تعمیر کے لئے ضروری خیال کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:۔

مردِ مومن پہ حسرا سانی شر؟ — خوف از اللہ لا خوف از لبشر!

تو کہ جذبِ لا الٰہ کا ایک کلیم — تجھکو ہر فرعون سے کیوں خوف و بیم

شر کلیدِ خیر ہے تیرے لئے — شر نوید خیر ہے تیرے لئے

شر سے حسنِ خیر عالم آشکار — شر عروسِ خیر کا ادنیٰ اسنگھار

ہے فرشتوں کے لئے بس خیر خیر — خیر امت کے لئے ہے شر و خیر

ابتدائے خیر و شر بایکدیگر　　انتہائے خیر و شر بایک دیگر

مسلمان کی حمیت کو بیدار کرنے کے لئے فرماتے ہیں :-

مسلمِ ہندی حیاؤ شرم و غیرت کیا ہوئی　　تیری خودداری ترے ایماں کی قوت کیا ہوئی

ننگ و ناموسِ سلف کی تیری دولت کیا ہوئی　　وہ ترے اسلاف کی آخر امانت کیا ہوئی

رنگ لیا ہے ہند نے تجھکو بھی اپنے رنگ میں

آگیا ہے تو بھی بس اس　کی پاسنگ میں

مسلمان کو اس کا مقام بتاتے ہیں :-

تجھ میں پنہاں ہیں علی سینکڑوں خالد لاکھوں

تو مگر حق و صداقت کی بھر آواز تو بن

ادنےٰ محمود سپاہی ہے ترے لشکر کا

رجز خوانانِ محمد کی تو آواز تو بن

پھر ترے دم سے مسخر نہ ہو عالم تو تو دیکھ

پھر دمِ حیدرِ کرار کا دم ساز تو بن

مثلِ پرکار تو ہو جائے گا عالم پہ محیط

اپنے مرکز کو سنبھالے ہوئے آغاز تو بن

کربلائیں ہیں بہت تیرے اُبھرنے کے لئے

سازِ شبیر سے نکلی ہوئی آواز تو بن

تو مسلمان سے مایوس نہ ہو اے قاسم

پیرو معتقدِ صاحبِ اعجاز تو بن

خرد کیا ہے فقط ایک بے وقوفی — جنوں ہی میں نہاں ہے فہم صوفی
جنوں کیا ہے خرد مندیِ شبتیر — خرد کیا ہے جنونِ مرد کوفی

قومیت کے جدید نظریات اُن کی نظر میں انسانیت کی تباہی کا باعث ہیں۔ کہتے ہیں:۔

نسل پر جب قوم کی بنیاد ہو — کیوں نہ دنیا اس طرح برباد ہو
کوہ و دشت و بحر و بر کو حد بناؤ — سگفریڈ و میگینو سرحد بناؤ
جس قدر قومی تحفظ ہے فزوں — اُس قدر قوموں کی حالت ہے زبوں
جب ہوں دارا و سکندر قوم گر — لینن و ڈوشے و ہٹلر قوم گر
بیٹھ کر در رسائل میں بنتی ہے قوم — غرض کی چھنٹی میں جب چھنتی ہے قوم
سینکڑوں قومیں بنیں ۲۰ سنہ میں — اور بگڑیں آ کے ۴۰ سنہ میں
قوم پر اک نسل بھی بیتی نہیں — مثلِ انساں بھی تو یہ جیتی نہیں
قوم اگر اقوامِ فاتح کی ہو ساخت — کیوں نہ ہو مفتوح سے تاراج و تاخت

وائے نادانیِ اقوامِ جہاں
وائے ناکامیِ اقوامِ جہاں

انسان کی خودی پہ اُنھیں ناز ہے:

کیوں ہم کو خودی پہ ناز نہ ہو آئینۂ خود بینی تھے ترے
تو قبلہ تھا ہم تھے قبلہ نما تو ساز تری آواز تھے ہم

وہ انقلاب کو زندگی سمجھتے ہیں، اُن کے نزدیک نقشِ حیات مٹ مٹ کر اُبھرتا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

جگا دے جو مسلم کو خوابِ گراں سے — وہی ایک اور کربلا چاہتا ہوں

ارضِ دکن سے اُنھیں اُنس ہے :

قاسم ہر ایک شجر میں ہے ایک گلستاں — خاکِ دکن سے بن گئے شیراز سینکڑوں

وہ ایک اچھے غزل گو بھی ہیں :-

میں دیکھ کر اُنھیں نگہ اشکبار سے — موتی پرو رہا ہوں نگاہوں کے تار سے
ذوقِ لباس عالمِ دیوانگی نہ پوچھ — دامن کو سی رہا ہوں گریباں کے تار سے
میرا چمن اُجاڑ کے محفل سجی گئی — اُن کی بہار آئی ہے میری بہار سے
دیوانگی میں شکوۂ افلاک بھی نہیں — اپنا فلک بناتا ہوں اپنے غبار سے
ذوقِ نمودِ صانعِ قدرت کی قدرتیں — ہیں پائیدار عالمِ ناپائیدار سے
ٹوٹے گا کیا سفینۂ اُمید لوٹ کر — ٹکرا کے ٹوٹ جائے گا ساحل کی مار سے
طوفاں سکونِ بحرِ کرم میں بپا نہ ہو — اک اشکِ چشمِ منفعل و شرمسار سے

عشق کے متعلق ارشاد ہوتا ہے :-

کمالِ عشق ہے محرومِ انتہا ہونا — بقا کے شوق ہے اُمید کا فنا ہونا
دوائے درد ہے خود درد لادوا ہونا — پیامِ موت ہے بیمار کا شفا ہونا

خدا کرے کہ مرے درد کو دوا نہ ملے
کبھی مجھے کسی منزل کا آسرا نہ ملے

عورت[1] اُن کی نظر میں متضاد خصوصیات کی حامل ہے :-

---

[1] نلدرگ کے ایک جلسۂ عام میں عورتوں نے درخواست کی کہ پردہ سے باہر نکل کر مرد رضاکاروں کے دوش بدوش پریڈ کی اُنھیں اجازت دی جائے۔ لیکن مجاہدِ اعظم نے فرمایا کہ

رحم اور سرد مہرباں تیری | مرہم و نیش ہے زباں تیری
عیش و عشرت میں برف کا ٹکڑا | اور مصیبت میں سوز سر تا پا
تو محبت بھی ہے عداوت بھی | بیوفائی بھی ہے مروت بھی

تو اک عورت ہے یا پہیلی ہے
جمع ضدین کی مثال ہے تو

مجاہد اعظم کا مکمل دیوان محفوظ ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) "اس کی ضرورت نہیں ہے جب تک کہ مرد تمہارا پردہ، تمہاری آبرو کا محافظ ہے۔

لہ اقبال کی طرح اُن کے خیال میں عورت کا منصب امومت ہے نہ کہ امامت۔ ایک مرتبہ میں کسی چینی مصنف کی کتاب "عورت" پڑھ رہا تھا۔ اُس نے لکھا تھا کہ عورت اُس وقت زیادہ دلکش معلوم ہوتی ہے جبکہ اُس کی گود میں بچّہ ہو۔ مجھے اس پر سخت حیرت ہوئی اور میں نے مجاہد اعظم سے اُن کی رائے دریافت کی۔ اُنھوں نے فرمایا کہ "کائنات کی ہر شئے اُس وقت حسین تر ہو جاتی ہے جبکہ اُس کی تخلیق کا مقصد پُورا ہوتا ہے۔"

باب یازدہم

گوہر نایاب

غیر مسلم سے روابط

مجاہد اعظم انسانیت کا احترام کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "میرا خدا رب العالمین ہے محض رب المسلمین ہی نہیں۔ اس لئے ہر انسان کی عزت اور خدمت مجھ پر واجب ہے" —— ہندوؤں اور غیر مسلموں سے اُن کے تعلقات اسی تصور پر مبنی ہیں۔ اُن کی زندگی میں متعدد ایسے واقعات ملتے ہیں جہاں مظلوم ہندوؤں کی اُنھوں نے نہایت فراخدلی سے مدد کی ہے۔ وہ ہندو طلبہ کی بھی حوصلہ افزائی کرتے اور اُنھیں مالی امداد دینے میں مسرت محسوس کرتے۔ وشوناتھ راؤ پٹیل موضع گنگاپور تعلقہ لاتور اُن کا چہیتا موکل تھا جس پر اُنھیں اس قدر اعتماد تھا کہ اپنی ساری جائداد اسی کے نام سے خریدی تھی۔ لاتور کے ایک ساہو بنکٹ لال جی اور ہائی اسکول لاتور کے صدر مدرس دیوی چرن چٹرجی

سے ایسے گہرے خاندانی تعلقات تھے کہ یہ دونوں اُن کی بیوی کو اپنی بیٹی اور اُنھیں اپنا داماد کہتے تھے۔

مملکتی مجلس کے صدر ہونے کے بعد بھی ہندوؤں سے اُن کے مراسم انتہائی دوستانہ تھے۔ ہریجن لیڈر مسٹر ونکٹ راؤ، اسٹیٹ کانگریس کے قائدین مسٹر جوشی اور پنڈت راماچاری سے مہر والفت ہی کا نیتجہ تھا کہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی مخالفت کے باوجود یہ حضرات لائق علی کابینہ میں شامل ہو گئے۔ اور مجاہد اعظم کے شانہ بشانہ اپنے ملک کی خدمت کرنے لگے۔ پنڈت سری پت رائے اور پنڈت راج موہن رائے جنھیں سرکاری نمایندوں کی حیثیت سے لائق علی کابینہ میں لیا گیا تھا مجاہد اعظم کے حلیفوں میں شمار ہوتے تھے۔

رضاکار تنظیم میں کم ازکم پندرہ فی صد غیر مسلم تھے، اور مجاہد اعظم کے باڈی گارڈ میں ایک ہندو بھی شامل تھا۔ اُن کا خاندانی ڈاکٹر کوئی مسلمان نہیں بلکہ ایک ہندو خاتون ڈاکٹر مس راج ہیں جنھیں انسانیت دوستی کی پاداش میں پاکستان کو ہجرت کرنی پڑی ہے اپنے مکتوب مورخہ ۲۲۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء میں وہ لکھتی ہیں :-

"مسٹر قاسم رضوی ایک دیانت دار انسان ہیں، جنھیں اپنی ذات اور اپنے چاہنے والوں پر مکمل اعتماد ہے۔ وہ ہر انسان کی عزت کرتے ہیں، اور ان کے نزدیک اعتقادات، مذہب

و ملت کا کوئی امتیاز نہیں ہے - ایک مرتبہ حیدرآباد دکن
کی وزارت کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے اُنھوں نے
مجھ سے کہا کہ اُنھیں سو فی صدی ہندو وزارت پر بھی
اعتراض نہ ہوگا، اگر وزراء دیانت داری کے ساتھ آزادیٔ
دکن کی حمایت کریں - وہ ایک سچے مسلمان ہیں اور دیگر
انسانوں کے عقائد کا احترام کرتے ہیں - ایک طبیب کی
حیثیت سے اُنھیں مجھ پر مکمل اعتماد تھا۔"

ہندوستانی فوج کشی سے قبل لاتور کے ایک جلسۂ عام میں
تقریر کرتے ہوئے مجاہد اعظم نے ہندوؤں کو مخاطب کر کے
فرمایا تھا:

"میں مسلمان ہوں اور مسلمانوں کا صدر ہوں، لیکن
آپ کی حفاظت اور آپ کی خدمت کا بھی ذمہ دار ہوں۔
اس فرض کی ادائی میں ناکام رہا تو اس منصب پر میرا
فائز رہنا نامناسب بلکہ بددیانتی پر مبنی ہوگا۔"

انسان اور انسانی خون کے احترام کا اندازہ اُن کے
ایک خط مؤرخہ ۴ - اکتوبر ۱۹۵۱ء سے ہو سکتا ہے جو اُنھوں نے
اپنے بیوی، بچوں کو جیل سے لکھا ہے :-

۴-۱۰-۵۱ ع

عزیز نوز، پیارے بچو! السلام علیکم - تم سب کی خیریت

پیارے ارشد کے خط سے یا کامل کے خط سے معلوم ہوتی رہتی ہے۔ خدا تم سب کو حفظ و امان میں رکھے۔ میں

"جس حال میں ہوں وقفِ تماشائے ادا ہوں
جس رنگ میں ہوں ماتمیِ رنگِ وفا ہوں"

اچھا ہوں، مزے میں ہوں۔ حقیقی زندگی کی اصلیتیں اور راحتیں معلوم کر رہا ہوں۔

نور! مجھے تم سے ایک خاص بات کہنی ہے، خدا کرے کہ یہ بات تم تک بغیر کٹی پھٹی پہونچ جائے۔ نور! افراد اور افراد کی زندگی قوموں اور قوموں کی حیات کے مقابلہ میں ہیچ بلکہ کچھ نہیں ہوا کرتی۔ دیکھو، میری ذات، میری حیات، میری موت کو دو ملکوں اور دو قوموں کے درمیان کسی طرح سے بھی بدمزگی کا سبب نہ بننے دو۔ دیکھو ہر دو بہت بھگت چکے ہیں اور اگر اس بھگتان میں اضافہ کیا گیا اور اضافہ کی وجہ میری ذات بنائی گئی تو مجھے بہت صدمہ ہوگا۔ میں تم سے خدا کو حاضر و ناظر جان کر تمھیں یقین دلا کر کہتا ہوں کہ میں جس حال میں بھی ہوں مجھے اب اس میں لطف آنے لگا ہے، اس لئے تم اور بچے میرے لئے متفکر نہ ہوں، اور اپنی پوری قوت اس پر صرف کر دو کہ میری ذات لاکھوں - کروڑوں کی حیات کی بدمزگی کا باعث نہ بنے

یہ میری تم سے استدعا ہے، خواہش ہے، حکم ہے۔ تم سب کا خدا حافظ۔ فقط۔

تمھارا قاسم

نلکتی مجلس اتحاد المسلمین کے جلسۂ سالانہ میں تقریر کرتے ہوئے اُنھوں نے فرمایا تھا:۔

"میں اپنے ہندو بھائیوں سے مخاطب ہوں —— آپ کی تلخی اور غصہ مجھے منظور، لیکن آپ سے میں التجا کروں گا کہ یقین اور بھروسہ کیجئے، ہم اور آپ مل کر چمنستانِ دکن کی آبیاری کریں گے اور ثمر کھائیں گے۔ ...... اور محبّت سے رہیں گے۔ ...... ہمیں راہِ عمل متعین کرنی ہے، اس کے لئے ضرورت ہے کہ ہم سر جوڑ کر بیٹھیں اور متفق ہو کر اُٹھیں"

"عیسائی بھائیو! دکن کو اپنا وطن سمجھو، سکون کے ساتھ زندگی بسر کرنا تمھیں مبارک ہو۔"

"سکھ بھائیو! تمھارا مشکور ہوں کہ تم نے پنجاب کے واقعات کو دکن میں اثر انداز نہ ہونے دیا ...... سب کو مل کر تعمیرِ وطن کرنا ہے۔ مرفہ الحالی کو تباہی میں بدلنا نہیں ہے۔"

"میرے پست کردہ بھائیو! تم انسانیت پر دھبّہ ہو۔ تم تمدن

وتہذیب کا ایک بہتا ہوا ناسور ہو۔ تمہارے سامنے ہر قوم مجرم ہے۔ ہندو اس لئے مجرم کہ وہ تمہاری پستی کے بانی ہیں، اور مسلمان اس لئے کہ وہ تمہاری حالتِ زار دیکھتے رہے.......... معاف کردے اے مقہور و مجبور انسان! ہمارے قصور کو معاف کردے! دکن کے مسلمان ساری غلطیوں کی تلافی کردیں گے۔ تجھے سطح انسانیت پر لائیں گے اور اپنی اخوت کے زمرہ میں شامل کریں گے۔"

"حیدرآباد باقی رہے گا ـــــــ ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی، عیسائی رہیں گے، پھولیں گے اور پھلیں گے!"

حیدرآباد دکن کے ہندوؤں پر مجاہدِ اعظم کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو رہی ہے، اور اُن کے کردار کی عظمت کا انھیں اندازہ ہونے لگا ہے۔ روزنامۂ "جنگ" کراچی مورخہ ۱۰۔ نومبر سنہ ۱۹۵۱ء کی اطلاع ہے کہ مجاہدِ اعظم کو جیل سے پولیس کی بند لاری میں عدالت لے جایا جا رہا تھا۔ راستہ میں لاری کا ایک ٹائر پھٹ گیا، اور دوسری لاری آنے تک ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک بڑا اجتماع ہو گیا، اور جب مجاہدِ اعظم دوسری لاری میں منتقل ہونے لگے تو "مجاہدِ دکن زندہ باد!" کا نعرہ بلند ہوا اور سارے شہر میں پھیل گیا!

مجاہدِ اعظم کی رہائی کے لئے حیدرآباد کی سیاسی جماعتوں کے

مسلسل مطالبات کی تفصیل گذشتہ اوراق میں پیش کی گئی ہے۔

مہاجرین

اگست ۱۹۴۷ء کے بعد مسلمانانِ ہند کے بے سرو سامان قافلے پاکستان اور حیدر آباد کی طرف روانہ ہونے لگے۔ دکن میں مجاہد اعظم نے ان کی آبادکاری کے لئے ممکنہ تدبیریں اختیار کیں۔ مہاجرین کے کیمپ قائم کئے جہاں حیدر آباد کی شکست تک اُنھیں مفت غذا تقسیم ہوتی رہی۔ اُنھوں نے مسلم عوام سے اپیل بھی کی تھی کہ ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق کچھ مہاجرین کو اپنے گھر میں مہمان کی حیثیت سے اُس وقت تک رکھے جب تک کہ اُنھیں ذرائع معاشں اور قیام کی سہولتیں حاصل نہ ہو جائیں۔ مسلمانوں نے بھی اپنے تمام وسائل اُن کی آبادکاری کے لئے وقف کر دیئے اور حکومت نے بھی اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

مجاہدِ اعظم کو مہاجرین سے جو محبت تھی اُس کا اندازہ خود اُن کی تقریر سے ہو سکتا ہے:۔

"مہاجرو! آپ پر مصیبت آئی، آپ آگئے، ہمارے ہو گئے، آپ ہمارے بھائی ہیں۔ آپ کا ہم پر حق تھا جسے ہم نے ادا کرنے کی کوشش کی۔ اگرچیکہ ہم نے آپ کو وہ آسائش نہیں دی جو آپ کو حاصل تھی۔ لیکن اس میں ہمارا قصور نہیں ہے۔

ہمارے پاس ایک روٹی سے زیادہ نہیں تھی، ایک کملی
اور ایک جھونپڑی تھی، ہم نے اس میں سے آدھی روٹی،
آدھی کملی اور آدھی جھونپڑی آپ کو دی — شکوہ نہ کیجئے
شکوہ غیروں سے ہوتا ہے۔ آپ آگئے، صاحبِ خانہ ہوگئے،
دکن اب آپ کا وطن ہے........خدا آپ کی تکلیف دُور
کردے گا۔"

(خطبۂ صدارت بابت ۴۸ء)

لیکن ۱۷۔ستمبر ۱۹۴۸ء کے بعد فوجی حکومت نے مہاجریں کے
تمام کمپ برخاست کردیئے، تمام رعایتیں اُن سے چھین لیں اور
مسلمانانِ دکن کے ساتھ اُن کا شیرازہ بکھیر دیا۔

شاہین بچّے

نوجوان اُن کی آنکھ کا نور ہیں، وہ اُنھیں شاہین بچے
کہتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے نورِ بصیرت سے جوانوں
میں عقابی روح بیدار کی، اُن کی منزل کو آسمانوں میں متعین کیا، اور
عیش و سرود کی محفل سے نکال کر اُنھیں رزم گاہِ حیات میں پہنچا دیا۔
وہ جوانوں کی خطاؤں کو نظر انداز کرتے اور ہر قدم پہ اُن کے
حوصلوں کو بڑھاتے ہیں، وہ اُنھیں سخت جان اور جفاکش سپاہی
دیکھنا چاہتے ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں شوال کی عید پہ اُن کے ایک عزیز
بناؤ سنگھار کرکے اُن سے ملنے آئے۔ ہاتھ میں ریشمی رومال تھا

سلک کی قمیص اور سلک ہی کی شیروانی زیب تن کئے، عطر میں لیسے ہوئے تھے۔ مجاہدِ اعظم نے اُن سے کہا کہ مجھے افسوس ہے اس دَور کے نوجوان منقلب ہوتے جا رہے ہیں۔ مجھے مسرت ہوتی اگر تمہارے جسم پر خاکی کھدڑ کے کپڑے ہوتے، اور عطر کی بجائے بارود کی بُو تمہارے کپڑوں سے آتی!

جوانوں کی تن آسانی کو دُور کر کے اُن میں زورِ حیدری اور استغنائے سلمانی وہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ نوجوان زمانہ کی رَو میں بہہ جانے کی بجائے زمانہ کو اپنے رنگ میں رنگ دیں۔ وہ زمانہ سازی کو بزدلی اور عیاری سمجھتے ہیں، اور جوانوں کو ہمیشہ نصیحت کرتے ہیں کہ

حدیثِ بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز
زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

خطابت

مجاہدِ اعظم اپنے ہم عصروں میں بہترین خطیب سمجھے جاتے ہیں۔ مجلس اتحاد المسلمین کی ترقی اور رضاکاروں کی تنظیم انہی کے اعجازِ خطابت کی رہینِ منت ہے۔ قرآن مجید ان کی خطابت کا سرچشمۂ آبِ حیات ہے، اور اسی منبع سے اُن کی ساحری نے فیض حاصل کیا ہے ——!

صداقت الفاظ بن کر اُن کی زبان پر آتی اور سُننے والوں کے قلوب کو بے چین کر دیتی ——! اور صداقت ہی کا اثر تھا

کہ اُن کی گرج سے پہاڑ لرزہ بر اندام اور بڑی با جبروت حکومتوں کے ایوان متزلزل ہو جاتے!

اُن کی ساحری نے کمزوروں کو طاقتور کیا، اُن کے نغموں نے مریضوں کو شفا عطا کی، اور جو حیات سے مایوس تھے اُنھیں حیاتِ نو بخشی! سوزِ جگر اُن کی نواؤں میں موجود تھا، عقابی روح تھی جو اُن کی خطابت میں جلوہ گر تھی —— جذبِ دل، سوزِ درول سے ٹکرا کر ساز بن گیا، اور رگِ ساز میں صاحبِ ساز کا لہو رواں ہو گیا —— ! اور یہی ساز تھا جس کی لَے پر دکن کا نوجوان آگے بڑھ کر چٹانوں سے ٹکرا رہا تھا، بلندیوں کو مغلوب اور موت پر فتح حاصل کرتا جا رہا تھا!!

خدا بیں و خدا ترس بیگم قاسم رضوی یہ کہتی ہیں کہ "گھونگھٹ اُٹھا کر پہلی مرتبہ جب میں نے اُنھیں دیکھا تو وہ نماز پڑھ رہے تھے" —— وہ عمر بھر نماز پڑھتے رہے اور اب دشمن کی سنگینوں کے زیرِ سایہ بھی نماز پڑھتے ہیں! —— قرآن کی تلاوت اُن کا ایک محبوب مشغلہ ہے اور اُسی کے منبعِ فیض سے اُن کے دل و دماغ کی آبیاری ہوئی ہے۔ وہ خود قرآن کے اسرار و معانی معلوم کرتے ہیں، دوسروں کو دعوتِ فکر دیتے ہیں، اور جیل میں تو اس قدر وِرد کیا ہے کہ قرآن کے اکثر حصّے ان کو حفظ ہو گئے ہیں۔

اُنھیں اپنے پروردگار سے عشق ہے۔ اُسی کی خوشنودی اُنھیں مطلوب اور اُسی کی راہ میں مصائب برداشت کرنا اُنھیں منظور ہے۔ وہ صرف اپنے خدا کے غیظ و غضب سے ڈرتے ہیں اور

"خوف از اللہ لاخوف از بشر"[1]

اُن کی زندگی کا عنوان ہے۔ انسانی جلال و جبروت یا دنیا کی کوئی قوت اُنھیں آج تک مرعوب نہ کرسکی اور دشمن کی اذیتیں یا قید تنہائی کی وحشتیں اُنھیں جبیں سائی پر مجبور نہ کرسکیں! جیل سے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"دوسرے ساتھی جب نزدیک تھے تو ہم بدنصیب اللہ سے دُور تھے، دوسرے ساتھی جب دُور ہوئے تو ہم اللہ سے نزدیک ہوئے، تنہائی کا وہی ساتھی، غم میں غمگسار۔ بہرکیف نہ تنہائی تنہائی ہے اور نہ غم غم نہ تکلیف تکلیف' اللہ کا شکر اُس کی مہربانی کا، جو کچھ ہوا اُس کی مرضی سے ہوا، اُس کے حکم سے ہوا۔

اللہ اللہ، اللہ اللہ کیسا مسبب الاسباب ہے۔ بس بس! وہی ہے وہی ہے، اور سب کچھ اُس کے آگے، ہیچ ہے' بیکار ہے، دھوکہ ہے' فریب ہے۔ اس پر اور صرف

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) لہ دیکھئے ضمیمہ (خط مورخہ ۲۵۔ڈسمبر ۴۸ء)

[1] یہ مصرعہ اُنہی کا ہے۔

اُس پر بھروسہ کرو، اور اُس سے اور صرف اُس سے دل لگاؤ، پھر دیکھو زندگی میں کیسی کیسی کامیابیاں اور کیسی کیسی مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔"

اور دوسرے مکتوب میں فرماتے ہیں:۔

"عید کی دعاؤں کا تار ملا، جس میں تم نے لکھا تھا کہ تمھاری حقیقی عید اُس وقت ہوگی جب کہ مجھ سے ملو گے۔ نہیں، نہیں، میرے پیارو! خدا کی راہ میں تمھارے عزیز بابا کا ایک ایک لمحہ جو مصیبت نما راحت میں گزر رہا ہے وہ تمھارے لئے عید ہونا چاہیئے۔ خدا کی طرف سے جو آزمائشیں ہوتی ہیں وہ مصیبت نہیں ہوتیں۔ یہ خوش نصیبی ہے کہ وہ مجھکو اپنی آزمائشوں کے قابل سمجھ رہا ہے۔ یہ سعادت پیغمبروں اور صالحوں کی تقدیر ہوا کرتی ہے۔ اگر میرے مالک نے مجھ ناچیز، حقیر، گنہگار بندہ کو اپنی آزمائشوں کا اہل تصور فرمایا۔ تو یہ اُس کی عین نوازش ہے، کرم ہے، احسان ہے! اگر وہ مجھ کو ہزار عمریں دے اور ہر عمر پوری آزمائش میں گزار دے تو میرے لئے اس سے بڑھکر اور کیا چیز قابلِ فخر ہو سکتی ہے۔ پیارو! دوست ہی دوست کو آزماتا ہے۔ اگر میرا پیارا مالک مجھے آزما رہا ہے تو یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ وہ مجھے اپنا دوست سمجھتا ہے! مجھے اور

کیا چاہیئے، اللہ اللہ، میرا اللہ مجھے دوست سمجھے!
بچو! مجھے دین اور دنیا دونوں مل گئے۔ تم بھی خوشی کرو کہ
تمہارا بابا دنیا میں آزمایا جا رہا ہے۔ اور جس قدر اس دنیا
میں آزمایا جائے گا اُسی قدر آخرت کا بوجھ کم ہوگا۔
مجھے مبارکباد دو، میرے جانشین خدا تمہیں صراطِ مستقیم
پر رکھتے ہوئے با اقبال اور با مراد کرے، شاد اور آباد رکھے"

مجاہدِ اعظم کا یہ رنگ دن بدن گہرا ہوتا جاتا ہے اور روحانیت
کے مرتبے بہت بلند معلوم ہوتے ہیں!

آتشِ نمرود کے شعلوں میں

مجاہدِ اعظم! ـــــ کس قدر عجیب انسان ہے!
جیل کی تاریکیوں میں اُس کا ضمیر ہمیشہ کی طرح
درخشاں اور طوفانی ہواؤں میں اُس کا کردار
پہلے سے زیادہ روشن ہے! اُس نے مصائب کو خوبصورتی اور مشکلات
کو کشش عطا کی ہے۔ سنگین الزامات اس پر عائد ہیں، موت اور حیات
کے دوراہے پر وہ کھڑا ہے۔ لیکن حیرت ناک حاضر خیالی سے وہ
گواہوں کے بیانات کو سنتا ہے، خود جرح کرتا ہے اور مقدمہ کی
ایک ایک تفصیل سے واقف ہے ـــــ! اور جب اُس کی
زندگی کا فیصلہ سنایا جا رہا تھا اُس کے چہرہ پر کوئی رنگ نہیں تھا۔
سزائے حبسِ دوام سننے کے بعد بھی اُس کے چہرہ پر زندگی باقی تھی

اُس کی شخصیت کی جاذبیت اور رچاؤ باقی تھا!! ـــــ اُس نے مسکرا کر عدالت کا شکریہ ادا کیا۔ وہ ایک مجاہد کے وقار کے ساتھ کھڑا تھا، جیسے ایک زندہ قوم کا عزم غازیانہ مجسّم ہو گیا ہو، جیسے کسی پیغمبر کی قوتِ ارادی مرتکز ہو گئی ہو، جیسے حُرّیت کی تاریخ انسانی روپ میں آ گئی ہو!

مجاہدِ اعظم! ـــــ کیسا مافوق الفطرت انسان ہے، یہ! زندگی اور موت سے بالاتر ہے۔ تکلیف و راحت اور رنج و مسرت کی قدروں سے بلند تر! اُس کو مقدمات کا غم نہیں ہے، اُسے چھوٹنے کی فکر نہیں، موت کی کوئی ہیبت نہیں! یہ اُس کے نزدیک معمولی باتیں ہیں، ناقابلِ لحاظ! بند تہہ خانہ کے گھناؤنے اندھیرے میں لکھے ہوئے اُس کے خطوط اُس کی روشن ضمیری کے مظہر ہیں ـــ!

"پیارے ارشد! جیو،

مقدمہ کی پیروی، مقدموں سے چھوٹنا یہ سب بڑی معمولی باتیں ہیں، ہمیں تو اُس مقدمہ کے لئے تیار ہونا ہے جہاں نہ ہماری پیروی کام دے گی نہ بحث کی باریکیاں۔ وہ عدالت ایسی ہو گی جہاں کوئی وکیل بھی پیروی نہ کر سکے گا۔ قوموں اور ملتوں کے بڑے وکیل جن کو پیغمبری کے مرتبے حاصل ہیں وہ بھی نفسی نفسی پکاریں گے۔ جہاں ہمارے ہاتھ پاؤں

آنکھ، ناک، کان منہ ہمارے خلاف گواہی دیں گے۔ ہمیں
اُس مقدمہ کے نتیجہ کی فکر کرنا ہے۔ اگر کوئی اطمینان ہے تو
صرف اس کا کہ اس بڑی عدالت کے جج نے فرمایا ہے، وہ
بھی ہمارے پیارے وکیل کے توسط سے کہ "اے میرے وہ
بندو جنھوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا ہے اللہ کی رحمت سے
مایوس مت ہو۔ اللہ تمام گناہ بخش دے گا، وہ غفور الرحیم ہے"
۔ خدا ہم کو اپنے پیارے رسول کے صدقہ میں اُس
مقدمہ میں بری کردے تو بس ہے۔ ان مقدمات کی پیروی
تیاری اور بحث تو صرف اس لئے کر رہا ہوں کہ کچھ دل بہل
جائے، اور کچھ وقت کٹ جائے۔ میرے لئے یہ مقدمات
وقت گزاری کے لئے بڑا اچھا مشغلہ ہیں، اور نتیجہ، تو نتیجہ
کی مجھے فکر ہے نہ پرواہ!"

آرزو کی انتہا دیکھئے :-

"تم نے لکھا ہے کہ یہ مقدمات خارج ہو جائیں تو بڑی خوشی
ہوگی۔ اگر ایسا ہوا بھی تو میرے لئے کوئی خاص بات نہیں البتہ
پیغمبروں کی ایک سنت سے محروم ہو جاؤں گا۔ میں تو چاہتا
ہوں کہ یا تو مجھے حضرت یوسف کی سنت کی تکمیل کا موقع
ملے اور مقدمہ چلانے والے اُن کی طرح مجھے سزائے قید دیں
یا پھر حضرت عیسیٰ کی سنت ادا کرنے کی سعادت حاصل ہو

مقدمہ چلانے والے اُن کی طرح مجھے پھانسی پر چڑھادیں۔ بچے!
یہ سعادتیں پیغمبروں کا مقدر ہیں۔ ہم کو نصیب ہوں تو اللہ کا شکر
فیصلہ کیا ہوگا۔ اس کی نہ مجھے فکر ہے نہ فکر کی ضرورت،

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا!

اور تم بھی اس کی فکر نہ کرو، جو کچھ ہوتا ہے خدا کی مرضی سے ہوتا ہے
اور جو کچھ خدا کی مرضی سے ہوگا اچھا ہوگا۔ خدا کی راہ میں یہ سعادت
اللہ اللہ اگر تمہارے بابا کا مقدر ہو جائے تو تمہاری آنے والی
نسلوں کے لئے فخر کرنے کی یہ بہت بڑی بات ہوگی۔ دعا کرو کہ
خدا تمہارے بابا کا جسم اور جان دونوں اپنی راہ میں قبول
فرمائے۔ آمین۔"

اور سزا سننے کے بعد:

"الحمد للہ! خدا نے میری بقیہ عمر کی نذر اپنی راہ میں قبول فرمائی
اس کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ اب حقیقی معنوں میں سنتِ یوسفی
کی تکمیل شروع ہوئی۔ خندق[1] کی سنتِ محمدی کی تکمیل ہو رہی
ہے! یا ایها المزمل[2] کی عملی شکل نظر آ رہی ہے۔ حضرت
زین العابدین کا پابجولاں، دربارِ یزید میں جانا عملاً پورا ہو رہا ہے!
صدقہ حبیب پاک کا کہ اللہ نے اُن کے طفیل میں یہ سنتیں

---

[1] اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ جیل میں اُن سے زمین کھدوائی جاتی ہے۔
[2] یعنی جیل میں انھیں ایک کمبل میں گزارنا پڑ رہا ہے۔

تکمیل کرادیں (چند سطور سنسر ہوگئیں) ہمتِ مرداں مددِ یزداں!
آخر ہر ہر قدم پر نہ صرف صبرِ جمیل عطا کر رہا ہے بلکہ شکر کی
توفیق اور لذتِ درد دیگر حمد کی تلقین فرما رہا ہے!"____

مجاہدِ اعظم! کیسا انوکھا انسان ہے تو! ____ مصیبتوں نے
تیرے کردار کو پرکھا، تباہیوں نے تیرے استقلال کو جانچا، لیکن
تیرے لہجہ میں کوئی فرق نہیں آیا ____ آتشِ نمرود کے شعلوں میں
بھی تو خاموش ہے! ____ تیری عظمت جریدۂ عالم پر ثبت ہو گئی ہے!!

بقائے دوام مجاہدِ اعظم! اسلام کا ایک درخشاں ستارہ ____ جو
نہایت تابناکی سے دکن کی اُفق پر چمکا۔ لیکن آندھیوں
اور تاریک گھٹاؤں نے اُسے گھیر لیا، اور دنیا یہ سمجھی کہ اب یہ ستارہ
جھلملائے گا۔ اس کی شعاعِ نور مدھم پڑ جائے گی، یا یہ ٹوٹ کر گرے گا؛
اور وحشت و بربریت کی پہنائیوں میں گم ہو جائے گا ____! دُنیا
غلط فہمی میں مبتلا تھی، اُس کی نظر دھوکہ کھا رہی تھی۔ تھوڑی دیر
میں ستارہ کی کرنیں آندھیوں کو چیرتی اور گھٹاؤں کو چاک
کرتی سطحِ زمین پر پہونچ گئیں اور دنیا کو معلوم ہو گیا کہ اُس کی
کرنیں مدھم نہیں پڑ سکتیں، اُس کے نور کو کوئی چھین نہیں سکتا ____
ستارہ ٹوٹ نہیں سکتا! وہ اپنی جگہ قائم ہے، اُسی تابنا کی
کے ساتھ!!

حریت کے آسمانوں میں کئی ستارے جھلملاتے رہتے ہیں، اور
کئی انجم تاریکی سے نجات کے لئے کشمکش کرتے رہتے ہیں ——
لیکن[1] دوام انھیں نصیب ہوتا ہے جو بے سروسامانی کے باوجود نازک ترین
لمحات میں بھی کشمکشِ انقلاب سے گریز نہیں کرتے۔ — ایسے ہی
سرفروشوں کی صفِ اول میں ممتاز مقام مجاہدِ اعظم کو حاصل ہے کہ جن کا
عزم معرکۂ حق و باطل کی تاریخ کے ایک جدید باب کا عنوان ہو گیا ہے
فی الحقیقت اُن کا یقین چٹان کی مانند غیر متزلزل، اُن کا عزم مصمم اور اُن
کی اُمیدیں خدا کے رازدانوں میں ہیں اور وہ انہی نہتے مجاہدین میں ہیں
جو ابتدائے آفرینش سے باوازِ بلند کہتے آئے ہیں اور سرفروشی
کی تاریخ کے ہر باب میں اپنے خونِ جگر سے تحریر کرتے آتے ہیں:

کافر ہو تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

مجاہدِ اعظم نے مسلمانوں کے سیاسی شعور کو بیدار کیا، اور
دکن کی ایک ایسی کشتی کو طوفانی موجوں سے نکال کر ساحل تک
پہنچانا چاہا جس کا لنگر توڑ دیا گیا تھا اور بادبان چاک چاک کر دیا

---

[1] قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ مرحوم نے اپنی زندگی بھر میں صرف تین اشخاص کے لئے "زندہ باد" کا نعرہ لگایا۔ ان میں ایک تو قائدِ اعظم ہیں جن سے نواب بہادر یار جنگ کو محبت تھی، دوسرے عثمان علی خاں ہیں جنھیں سیاسی اور دستوری مصلحتوں کی بناء پر زندہ باد کہا گیا، اور تیسرے مجاہدِ اعظم قاسم رضوی ہیں، جن کے محمود اعمال، اسلامی افکار اور غازیانہ کردار کی وجہ سے قائدِ ملت کو اُن سے دلی لگاؤ تھا۔

گیا تھا ـــــ رات تاریک ہو چکی تھی اور "خونِ صد ہزار انجم" سے صبحِ اُمید نمودار ہونے ہی کو تھی کہ مسلمانوں کے گھر کو گھر ہی کے چراغ سے آگ لگ گئی! ـــــ قسمت کی ستم ظریفی سے مجاہدِ اعظم کو ایک شکست ہوئی اور آزادی کی کشمکش میں وہ سلاخوں کے پیچھے چلے گئے ـــ لیکن اگر انھیں کامیابی ہوتی تو آج اسٹالن کے بعد ایشیا کے سب سے زیادہ طاقتور انسان ہوتے اور نہ معلوم سطحِ ارض پر کتنے نقش اُبھرتے اور کتنے مٹ جاتے!

آج مجاہدِ اعظم پنجۂ جور و ستم میں پھنسے ہوئے ہیں۔ آہنی دیواروں کے پیچھے تہہ خانہ کی تاریکیوں میں بند، اور اپنے چاہنے والوں کی نگاہوں سے اوجھل ہیں۔ لیکن وہ وہاں موجود ہیں جہاں وہ موجود رہنا چاہتے ہیں ـــــ مسلمانوں کے محبت بھرے دلوں کی گہرائیوں میں معرکۂ حق و باطل کی تاریخ کے سینے میں! وہاں وہ تا ابد موجود رہیں گے، اور جب تک کہ دنیا میں اسلام کا کوئی تخیّل اور نوعِ انسان میں حرّیت کا کوئی تصوّر موجود ہے، جب تک کہ ابراہیم (علیہ السلام) کا صدق اور اسماعیل (علیہ السلام) کا سوز باقی ہے اور جب تک کہ حسینؓ کا صبر اور اُن کے ایثار کی سچائی زندہ ہے اُس وقت تک مجاہدِ اعظم کے کارنامے بھی زندہ ہیں اور مجاہدِ اعظم بھی زندہ ہیں!! ـــــ زنجیروں میں جکڑا ہوا اُن کا جسم ہم سے بہت دُور ہے لیکن

Mohammad

Ali Rahi.

off A.B. seenia line,

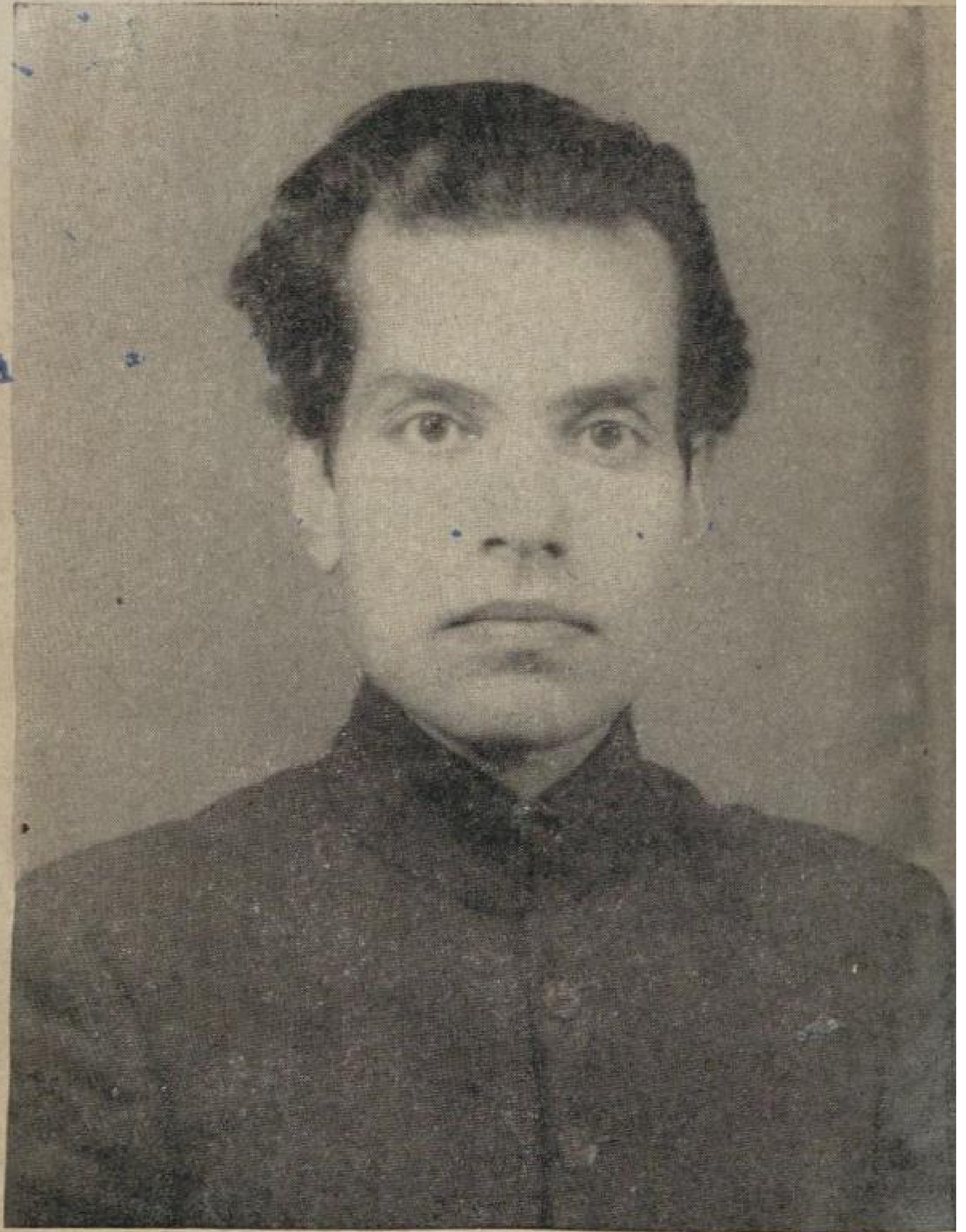
Arababad, Sheikh Hotel,

hut No. 442. Karachi,

Pakistan.

23. 8. 1983

[signature]



مئولف

نگاہِ حقیقت بیں سے دیکھیے کہ آج بھی صداقت کا یہ روشن ستارہ اُفقِ انسانیت پر مسکرا رہا ہے اور حریت کی منزل کا نشانِ راہ بتا رہا ہے !!!

جنوری ۱۹۵۲ء

۹۹ - بہادر یار جنگ کالونی - کراچی نمبر ۵



ضمیمہ

جیل سے لکھے ہوئے خطوط

مجاہد اعظم کے جیل سے لکھے ہوئے چند خطوط
بلا تبصرہ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں

(۲۸۶)

ترجمۂ خط مؤرخہ ۳۰۔ اکتوبر ۱۹۴۸ء

پیاری امّو جان، پیارے بابو جان، پاشا، عارف، ذکیہ، مان، رضیہ، فوزیہ، طیّبہ، گگم اور عزیزیہ نور!

خدا تم سب پر فضل کرے اور تمہاری حفاظت فرمائے۔ میں بالکل اچھا ہوں۔ میرے پیارو میرے لئے فکر نہ کرو۔ امّو جان! میں نے تمھیں ایک خط لکھا تھا لیکن جواب نہ ملا۔ خدا جانے تمھیں وہ خط وصول ہوا یا نہیں۔ اسی قادرِ مطلق پر ایمان اور بھروسہ رکھو جو فرماتا ہے "ایسی چیزیں بھی ہیں جن کو ممکن ہے کہ تم ناپسند کرو، حالانکہ وہ تمہارے لئے مفید ہوں اور ممکن ہے کہ ایسی چیزیں بھی موجود ہوں جن کو تم پسند کریں، حالانکہ وہ تمہارے لئے مضر ہوں۔ ہر چیز کہ تم نہیں جانتے جو اللہ کے علم میں ہے۔" اس لئے جو کچھ ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے یا ہونے والا ہے وہ سب اُسی علیم و قدیر کی منشاء و مرضی کے مطابق ہے اور ہم سب کو خندہ پیشانی، اطمینان اور غیر فانی اُمید کے ساتھ اُس کے آگے نہ صرف سرِ تسلیم خم کرنا چاہیئے بلکہ اس کا خیر مقدم بھی کرنا چاہیئے۔ امّو جان ہماری کمزوری صرف یہ ہے کہ اللہ پر ہمارا ایمان باقی نہیں رہا، وہ بہت بڑا، جلال و جبروت والا اور ہمارے تصور سے زیادہ طاقت والا ہے۔ اس پر بھروسہ اور کامل ایمان رکھو۔

اور کوئی فکر نہ کرو۔ دن اور رات، چاندنی اور اندھیرا، گرما اور سرما یہ تمام خداوند عالم کی مرضی کے مظاہر ہیں، اور یہی حال انسانی زندگی کے نشیب و فراز کا ہے۔ زمانہ ہمیشہ سے تبدیل پذیر ہے اور ہمیں کسی تبدیلی سے متاثر نہیں ہونا چاہیئے۔ ہر کیفیت گزر جاتی ہے اور درا صل اس میں بھلائی مضمر ہوتی ہے جسے ہم نہیں سمجھتے۔ اس لئے ہر اُس شخص کو جو اللہ اور اُس کی رحمتوں پر کامل بھروسہ رکھتا ہے، ہمیشہ بہتری کی امید رکھنی چاہیئے۔ میری دلیر بیٹی ہمت سے کام لو اور اپنے چھوٹے بھائی بہنوں اور کمزور و بیمار ماں کے دل بڑھاؤ۔ تم سب کے لئے میں ہر لمحہ دعا کرتا ہوں اور مجھے اَللّٰہُ خَیْرٌ حَفِیظ پر کامل اعتماد ہے کہ وہ تمہاری حفاظت کرے گا۔ مجھے ہر ہفتہ دو خطوط لکھنے کی اجازت ہے اس لئے میں تمھیں لکھتا جاؤں گا جب تک کہ یہ اجازت باقی ہے

کلام اقبال روانہ کرو، ڈاکٹر راج کو سلام اور دیوالی مبارک، بگم کی صحت سے مجھے تشویش ہے۔ ڈاکٹر راج سے کہو کہ وقتاً فوقتاً اُس کا امتحان کیا کرے۔

تمہارا بابا
قاسم

ترجمہ خط مؤرخہ ۱۴۔ اکتوبر ۱۹۴۳ء

میری عزیز ترین امو جان، نور اور میرے پیارے بچو!

آج عید ہے، اس لئے تم سب کو عید مبارک۔ اتّو جان[1] میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میری صحت اچھی ہے۔ میرے متعلق پریشان مت ہو۔ ۱۲ تاریخ تک میں سکندر آباد جیل میں تھا اور اس کے بعد مجھے یہاں لایا گیا میں یہاں آرام سے ہوں۔ جب میں یہاں آرہا تھا، مجھے اپنا سوٹ کیس اور ہولڈال دیا گیا۔ تم نے جو کچھ بھیجا اُس کا شکریہ۔

اتّو جان تم سب میں بڑی اور سب سے زیادہ دلیر ہو۔ ہمت سے کام لو، اماں اور تمام بھائی بہنوں کے حوصلہ کو برقرار رکھو اور اُن کی حفاظت کرو۔ جرأت سے حالات کا مقابلہ کرو۔ خدا کو جو منظور ہوتا ہے اچھا ہی ہوتا ہے۔ ہمیں اُس کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کرنا چاہیئے۔ بابو[2] کا بہت زیادہ خیال رکھو۔ اُن سے کہو کہ وہ فوراً کالج میں شریک ہو جائیں اور محنت سے کام کریں۔ باشا[3] سے بھی کہو کہ محنت کرکے امتحان میں کامیابی حاصل کریں۔ حالات کے لحاظ سے تم جو مناسب سمجھتی ہو کرو اور بابو و پاشا سے کہو کہ بلا ضرورت باہر نہ گھومتے رہیں۔ تم چاہو تو سگریٹ، دیا سلائی اور کھانے کے لئے کوئی خشک چیز مثلاً باجرے کی ٹکیہ اور اچار وغیرہ روانہ کر سکتی ہو۔

بچوں کو پیار۔ اباجیا[4] اور بی اماں[5] کو آداب اور اقبال[6] کو دعا۔ وزیر[7] کیسا ہے، اُس کو اور دیگر پرسانِ حال کو سلام۔ طیب بھائی[8]۔ ممی[9]

---

[1] بڑی صاحبزادی کو وہ اتّو جان کہتے ہیں۔ [2] کاظم رضوی کی عرفیت [3] آصف رضوی کی عرفیت ہے۔ [4] اپنے خسر عبدالحی صاحب رضوی کو وہ "اباجیا" کہتے ہیں [5] خورشید امن صاحبہ کو "بی اماں" کہتے ہیں [6] یہ اُن کی سالی ہیں۔ [7] یہ ان کے پرائیویٹ سکریٹری تھے [8] اُن کے چھوٹے بھائی کی عرفیت ہے۔

اور دوسروں کو پیار۔ امّو جان پیاری ذکیہ سے کہنا کہ وہ چھوٹے بچوں کی نگرانی کریں، اُن سے کہنا کہ خوب پڑھیں۔ ذکیہ ماں۔ رضیہ طیّبہ گکّم[۹] بابو اور باشا اور عارف کو بہت بہت پیار! ڈاکٹر راج اور حکیم صاحب کو سلام

امّو جان، مجھے صرف خانگی حالات لکھا کرو۔ ہمّت سے کام لو، میری پیاری امّو جان! خدا تمھاری مدد فرمائے، وہ تم سب کی مدد کریگا۔ انشاءاللہ۔

میں روزانہ قرآن شریف کی تلاوت کرتا ہوں، تم سب کو بھی تلاوت کرنی چاہیئے۔

خدا حافظ امّو جان

تمہارا چاہنے والا پاپا

قاسم

ترجمہ خط مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۸۶ء

عزیز نور[۱۰] پیاری امّو جان، پیارے بابو، باشا، ارشد، عارف ذکیہ ماں، رضیہ، فوزیہ، طیّبہ، گکّم بابو! سلام۔ پیار

امّو جانی، شکر ہے خدا کا کہ تمہارا خط اور تمہاری مرسلہ اشیاء وصول ہوئے۔ تقریباً تین ماہ بعد مجھے تمہارا حال معلوم ہوا، میری ماں۔ میں نہیں بتا سکتا کہ تمہارے محبت نامہ نے مجھے کس قدر سکون بخشا۔ خدا تمہاری حفاظت کرے۔ (ایک جملہ سنسر کر دیا گیا) امّو ہر ہفتہ مجھے لکھا کرو۔

---

[۹] نامر رضوی کی عرفیت ہے۔ [۱۰] بیگم قاسم رضوی

تاکہ مجھے اطمینان نصیب ہو، میں بھی تمھیں ہر ہفتہ لکھتا جاؤں گا۔ تم اپنے خطوط ملٹری گورنر کے توسط سے روانہ کیا کرو۔

اتّو جان، خدا کی مرضی کے آگے بہر صورت ہمیں سر تسلیم خم کرنا چاہیئے۔ ہمیں اُس پر ایمان رکھنا چاہیئے، اور اُسی سے اُمیدیں وابستہ کرنی چاہیئے، وہ قادر مطلق، ارحم الراحمین صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ ان اللہ مع الصابرین۔ اس لئے ہمت بلند رکھو، صبر کرو اور اللہ کی اعانت پر کامل اعتماد رکھو۔

عزیزہ نور، تم ہمیشہ دلیر اور باہمت رہی ہو اور اب تمھارا امتحان ہے سارے خاندان کی ذمہ داری تم پر تھی، جس کو تم نے خوش اسلوبی سے پورا کیا، لیکن اب کئی گنا زیادہ ذمہ داریاں تم پر آپڑی ہیں۔ عزیزہ نور، انھیں تم ثابت قدمی سے برداشت کرو، اور اس تاریک دور سے گزر جاؤ۔ زمانہ ہمیشہ یکساں نہیں رہتا۔ ممکن ہے کہ ہمیں اس سے بدتر حالات کا مقابلہ کرنا پڑے۔ اگر ایسا ہو بھی تو انشاءاللہ ہم عزت اور ہمت سے مقابلہ کریں گے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ تم ہمت نہ ہارو، اور خدا پر اپنے ایقان کو متزلزل نہ ہونے دو۔

اتّو! تم نے جو کچھ بھیجا اُس کا شکریہ۔ یہاں میں بالکل اچھا ہوں، صبح سویرے جاگتا ہوں، نمازِ فجر کے بعد آٹھ بجے تک قرآن پڑھتا ہوں آٹھ بجے چائے پیتا ہوں، ضروریات سے فارغ ہو کر پھر قرآن کی تلاوت شروع کر دیتا ہوں۔ دس اور گیارہ کے درمیان کھانا ہوتا ہے، پھر قرآن

بارہ اور ایک کے درمیان چائے اور اُردو اخبارات۔ ظہر کی نماز کے بعد پھر قرآن، ۳ بجے حمام اور چار بجے تک انگریزی اخبارات، چار اور پانچ بجے کے درمیان کھانا، پانچ بجے نماز عصر اور مغرب کی نماز تک وظیفہ، بعد نماز مغرب نماز عشاء تک پھر وظیفہ۔ اور اس کے بعد میں سو جاتا ہوں۔ سب کو میری طرف سے سلام۔ خدا حافظ۔

نوٹ: میں نے اُردو نظم میں ایک خط تمہارے لئے لکھا ہے، لیکن یہاں سنسر کرنے والے اُردو نہیں جانتے، اس لئے بھیجنے میں دشواری ہے۔

تمہارا بابا
قاسم

۷۸۶

ترجمۂ خط مورخہ ۲۵۔ دسمبر ۱۹۴۸ء

اتو جانی۔ اللہ رحیم اور حفیظ ہے، وہ تمہاری حفاظت کرے گا۔ وہی جانتا ہے کہ ہمارے لئے کونسی بات مفید ہے اور کونسی مضر۔ اس لئے اپنے مستقبل کو اُسی کے یدِ خیر میں چھوڑ دینا چاہیئے!

کل میں نے قرآن مجید کا پانچواں دَور ختم کر کے چھٹا شروع کیا۔ تلاوت کا کیا لطف بیان کروں! اس تنہائی اور خاموشی میں یہ حقیقت میں عبادت ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ گویا خدا کے سامنے بیٹھکر قرآن پڑھ رہا ہوں۔ بالخصوص طلوعِ آفتاب سے قبل عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ فی الحقیقت اللہ کتنا سچا ہے۔ قرآن مجید کی ایک

آیت ہے کہ " فجر کے وقت قرآن کی تلاوت اللہ کے سامنے ہوتی ہے"۔
اور بخدا ایسا ہی ہے، سخت سردی میں ٹھنڈے پانی سے صبح سویرے
وضو کرنا کس قدر پُر لطف ہوتا ہے اتو جان! فضا کتنی پُر سکون ہے ۔اس
کا سکوت صرف پرندوں کے نغموں سے ٹوٹتا ہے جو در اصل خدا ہی
کی عبادت کرتے ہیں۔ بہر حال قرآن ہی میرے سکونِ قلب کا منبع
اور دنیا و آخرت کی امیدوں کا سہارا ہے۔ اتو جان۔ جب میں
طلوع آفتاب سے قبل کی خاموشی میں دعا مانگتا ہوں کہ" ربنا اٰتنا
فی الدُّنیا حسَنَۃ وَّ فی الاٰخرۃ حسنۃ وّ قنا عذاب النّار" تو میں
کہہ نہیں سکتا کہ میرے دل کا بوجھ کس قدر ہلکا ہو جاتا ہے اور مجھے کتنا
یقین اور اطمینان ہو جاتا ہے۔ میں یہ ساری باتیں تمھیں اس لئے
لکھ رہا ہوں کہ تمہارے سب کے دلوں میں بھی خدا اور اُس کی رحمتوں پر اعتماد
مستحکم ہو جائے۔ دنیوی تکالیف اور پریشانیوں کی کوئی اصلیت نہیں ہوتی۔ یہ
سب چلتا پھرتا سایہ ہیں۔ ان سے سابقہ ہو تو خندہ پیشانی سے ان کا مقابلہ
کرنا چاہیئے۔ جس چیز کا ہمیں خیال اور خوف ہونا چاہیئے وہ دوسری
دنیا ہے۔ ہمیں روزِ حشر کے لئے تیار ہونا چاہیئے اور اللہ کے عفو و
کرم کے لئے دعا کرنی چاہیئے کہ اُسی کے رحم و کرم اور پیارے رسول
کی شفاعت سے ہمیں نجات مل سکتی ہے۔

خدا علیم و بصیر ہے، اُس کے آگے ہر چیز ہیچ ہے۔ ہمیں اُسی
قادرِ مطلق پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔ میں اس سلسلہ میں اپنا ہی ایک شعر مع

ترجمہ درج ذیل کرتا ہوں:

یہ موت کیا ہو کسی کے وصال کا پیغام
یہ زندگی کے عوض مل رہی ہے سستی ہے

خدا حافظ

تمہارا بابا

قاسم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

ترجمہ خط مورخہ ۱۲-جنوری ۴۹ء

عید میلاد النبی مبارک

خدا تمہارا محافظ اور پیارے رسول تمہارے شفیع ہوں۔

امّو جانی! آج ربیع الاول کی ۱۲- تاریخ ہے جو سب سے بڑی عید کا دن ہے، میری جانب سے دوبارہ اس عید کی مبارکباد قبول کرو۔ میں تقریباً رات بھر جاگتا اور عبادت کرتا رہا۔ تھوڑی دیر کے لئے سویا لیکن چار بجے اُٹھ گیا۔ چھ بجے تک وظیفہ پڑھتا رہا اور ٹھیک چھ بجے (علیگڑھ چھوڑنے کے بعد پہلی مرتبہ علی الصباح ٹھنڈے پانی سے) حمام کیا۔ نماز فجر ادا کی، اور خوشبو کے لئے الائچی کے چھلکے آگ میں ڈالے کیونکہ عود بتی یا لوبان میرے پاس نہیں تھا۔ پھر فاتحہ اور درود کا سلسلہ شروع کیا۔ (پیاری امّو، اس قدر لکھا ہی تھا کہ ایک افسر نے تمہارا خط[۱] میرے حوالے کیا

---

[۱] اس خط میں فاروق کی ولادت کی اطلاع دی گئی تھی۔

کس قدر خوش آئند تھا۔ میرے پیارو ننھے فاروق کے لئے میری مبارکباد قبول کرو) تمھارے اس خط کے بارے میں آگے چل کر لکھتا ہوں فی الوقت میں اپنا مضمون جاری رکھتا ہوں.

جی ہاں تو میں نے کافی بنائی اور اس پر فاتحہ پڑھی، اور پھر یہ خط لکھنا شروع کیا کہ تمھارا خط دستیاب ہوا۔ پیارو خدا کا شکر ادا کرو، وہ کس قدر مہربان ہے۔ خدا ننھے، صالح. فاروق پر مہربان ہو.

ننھے فاروق کو میری طرف سے خوب پیار کرو، یہاں تک کہ اُس کے دونوں گال سُرخ ہو جائیں . اور اُس کے نازک کانوں میں آہستہ سے بولو کہ یہ بوسے اُس کے بابا کی جانب سے ہیں جس نے ابھی تک اُسے نہیں دیکھا ہے. امّو جی، مجھے یاد آتا ہے کہ تم جب پیدا ہوئی تھیں مَیں علیگڈھ میں تھا اور میں نے تمھیں اُس وقت دیکھا تھا جبکہ تم کافی بڑی ہو چکی تھیں۔ خدا کرے کہ ہم اچھے حالات میں ملیں، اور اُس وقت مَیں فاروق کو پیار کروں گا جس طرح کہ کچھ سال پہلے میں نے تمھیں پیار کیا تھا۔

تمہارا بابا قاسم

ترجمہ خط مؤرخہ ۱۸۔جنوری ۱۹۴۹ء $\frac{۲۸۹}{۹۲}$

امّو جان! میں بالکل اچھا ہوں۔ اماں کیسی ہیں اور بچوں کا کیا حال ہے، میرے پیارے بابو جیا اور باتنا جانی! میری توقعات تم سے وابستہ ہیں۔ مجھے

یقین ہے کہ تم اپنے آبا و اجداد کا نام روشن کرو گے۔ انسان کا کردار اُس کی دولت ہے اس لئے تم نیک خیالات کی پرورش کرو۔ محبت اور سادگی سے پیش آؤ۔ معاملات میں سچائی اور ایمانداری سے کام لو۔ سادہ اور پاکیزہ عادات اختیار کرو، بڑوں کا ادب اور چھوٹوں کا لحاظ کرو۔ عام معلومات کی کتابیں، رسول اکرم کی سوانح حیات پڑھو۔ مشاہیر کی زندگی اور مختلف ممالک کی تواریخ کا مطالعہ کرو۔ اخبارات پابندی سے دیکھا کرو۔ نصاب کی کتابیں محض رہنمائی کرتی ہیں۔ اس لئے خارج از نصاب کتابوں کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ خدا تمہاری مدد کرے۔ اور سچّے مومن کی زندگی تمہیں عطا فرمائے۔ قرآن شریف کی تلاوت ہرگز ترک مت کرو۔ کیونکہ یہی تمہاری صالح زندگی کی ضامن ہے۔

امّو جان! تم چاہتی ہو کہ میں تم لوگوں کی فکر نہ کروں۔ اور خدا کے چند نیک بندوں نے مجھ سے آکر یہی کہا کہ میں بچوں کی فکر نہ کروں۔ میں خود بھی سوچتا ہوں کہ ایسی فکر سے کیا حاصل۔ لیکن پھر بھی مجھے فکر ہوتی ہے۔ امّو جی۔ جب میں قرآن شریف میں سورۂ یوسف پڑھتا ہوں تو مجھے ان تمام سوالات کا جواب مل جاتا ہے، اور میں اس ساری فکر کا جواز محسوس کرتا ہوں۔ مجھے اطمینان اس بات کا ہوتا ہے کہ اگر میں فکر کرتا ہوں تو یہ میری کمزوری نہیں ہے۔ سورۂ یوسف کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہی تمام قصوں میں افضل ہے، اور امّو جی فی الحقیقت ایسا ہی ہے۔ حضرت یعقوب۔ ملحوظ خاطر رہے

کہ یہ بڑے پیغمبروں میں سے ایک ہیں۔ اپنے ایک بچے سے بچھڑ گئے تھے۔ حالانکہ دوسرے دس ۱۰/۱۱ بچے اُن کے ساتھ تھے۔ تاہم وہ پریشان ہوتے اور مسلسل روتے رہے، یہاں تک کہ اُن کی بینائی زائل اور ان کی صحت خراب ہو گئی۔ لیکن ممو جان! میں تو ایک معمولی انسان ہوں مجھے پیغمبروں کا دل و دماغ بھی حاصل نہیں ہے اور اپنے دس یوسفوں سے جدا کر دیا گیا ہوں۔ پھر تعجب کیا ہے اگر مجھے تشویش اور پریشانی لاحق ہوتی ہے۔ تم میری کیفیت کا اندازہ کرو کہ میں اپنی عزیزہ نور، اور دس پیارے بچوں سے جدا کر دیا گیا ہوں، جو تنہا بہ تقدیر اور لاچار ہو گئے ہیں۔ ایسی حالت میں اپنی تشویش کو میں کیا کروں۔ لیکن امتو جانی! یقین کرو کہ میں اس کو ہمت اور استقلال سے برداشت کر رہا ہوں۔ میں قادر مطلق پر غیر متزلزل ایمان اور ارحم الراحمین کی ذات سے مستحکم امیدوں کے ساتھ اس کو برداشت کر رہا ہوں۔ اس لئے تم میری پریشانیوں کے بارے میں متفکر مت ہو۔ یہ سب ختم ہو جائیں گی جب ہم پھر ایک دوسرے سے ملیں گے۔ اس لئے ہمیں چاہیئے کہ جرأت سے ان کا مقابلہ کریں۔ یہاں تک کہ وہ آئینِ فطرت کے مطابق ختم ہو جائیں تم عبادت کئے جاؤ، عبادت میں بڑی طاقتیں مضمر ہوتی ہیں۔ جب معبود حقیقی اپنے بندے کو عبادت میں دیکھتا ہے تو اُس کے دریائے رحمت میں جوش آتا ہے، اور وہ اپنے بندے پر رحمتیں و برکتیں نازل کرنے لگتا ہے۔ اس لئے میرے پیارو تم سب میرے لئے دُعا کرو

اور میں تمہارے لئے دعا کرتا ہوں، مجھے یقین ہے کہ ایک نہ ایک روز وہ میری یا دس معصومین کی آواز کو سُن لے گا۔ اتو جان! اُس نے جو کچھ میرے لئے کیا ہے یا جو کچھ آئندہ کرنے والا ہے، مَیں اُس سے بالکل مطمئن ہوں۔ اور اگر میں اطمینان محسوس کر کے اُس کا شکر ادا نہ کروں تو یہ میرے ایمان کی کمزوری ہو گی۔ جب کبھی مجھے ذہنی اُلجھن ہوتی ہے تو میں قرآن شریف کی یہ آیت پڑھ لیتا ہوں کہ "انسان کسی چیز کو مضر سمجھتا ہے حالانکہ وہ مفید ہوتی ہے، اور کسی چیز کو مفید سمجھتا ہے، حالانکہ وہ مضر ہوتی ہے۔ انسان بے خبر ہے اور میں ہر چیز کا جاننے والا ہوں۔" اور اس کے بعد میں دعا کرتا ہوں کہ:-

رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ

یعنی اے میرے رب جو کچھ بھی بھلائی تیری طرف سے آتی ہے میں اُس کا فقیر ہوں۔ اور اتو جانی! اللہ کی طرف سے انسان پر کبھی بُرائی نازل نہیں کی جاتی۔ انسان ہی در حقیقت اپنے لئے بُرائی پیدا کرتا ہے۔

خدا حافظ

تمہارا بابا
قاسم

ترجمہ خط مورخہ ۲۱- جنوری ۱۹۴۹ء ۸۶/۹۲

عزیز نور اور پیارے بچو! تمہارا خط پڑھنے سے مجھے خوشی، اور

تمھیں خط لکھنے میں مسرت محسوس ہوتی ہے۔ تم نے لکھا ہے کہ میں تمھیں زیادہ سے زیادہ خطوط لکھوں۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں لیکن اس کو کیا کروں کہ مجھے صرف دو خطوط ہر ہفتہ لکھنے کی اجازت ہے اس لیئے میں دونوں لکھ لیتا ہوں، ایک تو روانہ کر دیتا ہوں اور دوسرا اپنے پاس محفوظ رکھتا ہوں تاکہ تمھارا خط دیکھنے کے بعد اس میں ضرورتاً اضافہ کر سکوں۔ لیکن میں نے اپنی اور تمھاری خواہشات کے مطابق اس مشکل کا ایک حل دریافت کر لیا ہے۔ میں خط لکھنا شروع کرونگا جیسا کہ میں نے اس وقت کیا ہے۔ میں کچھ لکھنے کے بعد رک جاؤں گا، اور پھر دوسرے دن اس میں کچھ اضافہ کروں گا، اور اسی طرح سلسلہ جاری رہے گا۔ کیا تم اس خیال کو پسند کرو گی امو جان؟ —— کل تک کے لئے خدا حافظ!

۲۲/۱ ۷-۲۵، ساعت صبح۔ امو جانی! نماز فجر ادا کر کے چائے پی رہا ہوں۔ یہ دوسری پیالی اور پہلا سگریٹ ہے —— لیکن امو تم میرے ساتھ ہو! میں تمھیں اپنے خیال کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کالج کے لئے کپڑے پہن کر ناشتہ کر رہی ہو۔ میں تم سے باتیں کر رہا ہوں۔ اور تم سے کہتا ہوں کہ میرے ساتھ چائے پیو۔ دیکھو میں تمھیں تھوڑی سی چائے دیتا ہوں۔ مگر تم کہتی ہو "نہیں بابا، شکریہ، میں کچھ دودھ پینا چاہتی ہوں۔" بہت اچھا، جیسی تمھاری مرضی ہو۔ اماں قرآن شریف پڑھ رہی ہیں۔ فوزیہ۔ طیبہ۔ اور کلثم

فاروق کے پاس جمع ہیں، فوزیہ اُسے گود میں اُٹھا لیتی ہے ——
اور میں دوسرا سگریٹ جلاتا ہوں۔ تمہارے لئے سواری آ جاتی ہے
"آج تم بہت سویرے جا رہی ہو امّو جان"۔ "ہاں بابا، مجھے آج کچھ
تجربات کرنے ہیں، خدا حافظ بابا"۔ "خدا حافظ ممّی"۔ میں تمہیں
دوپہر میں لکھوں گا!

ایک ساعت دن۔ امّو جانی! صبح تمہیں خدا حافظ کہہ کر میں نے
قرآن کی تلاوت کی۔ اس کے بعد میں نے میڈم کیوری کی سوانح عمری
پڑھی، کیسی عجیب و غریب ہے! کاش تمہاری زندگی بھی ویسی ہی ہو۔
وہ بہت بڑی سائنس داں تھی، جس نے ریڈیم ایجاد کر کے انسانیت
کو اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ تم اس وقت ½ ڈاکٹر ہو اور میں سمجھتا
ہوں کہ تم اُسے جانتی ہو۔ اگر نہیں جانتی ہو تو اس کی سوانح عمری
ضرور پڑھو۔ وہ چاہتی تو اپنے زمانہ کی مالدار ترین عورت ہوتی اگر
وہ اپنی ایجادات کو پیٹنٹ کراتی، لیکن اس نے نوعِ انسان کی خاطر
ایسا نہیں کیا، بلکہ آخر وقت تک افلاس میں زندگی بسر کی۔ کاش
تمہاری زندگی بھی ایسی ہی ہو۔ امّو جانی تمہیں اس کا موقع حاصل ہے
تم ایک ڈاکٹر ہونے والی ہو۔ خدا کرے کہ تمہیں اپنے پیشہ میں
کامیابی ہو، اور تمہاری زندگی غریبوں کی خدمت کے لئے وقف ہو۔
—— اس وقت سوا بجا ہے، ظہر کی نماز ادا کرنا ہے۔ اللہ! اللہ!
۵½ ساعت شام۔ پانچ بجے میں نے کھانا کھایا ہے۔ ممّو جان،

آج میں نے اٹھارہ سگریٹ پیئے، اوسطاً پندرہ سگریٹ روزانہ پینے لگا ہوں، لیکن چائے کم کردی ہے۔ خدا حافظ کل تک کے لئے ــــــ!

، ساعت شام۔ پیاری امّو جان، میں نے تمہیں خدا حافظ کہا تھا لیکن مغرب کی فرض نماز ادا کرتے ہی ایک افسر نے تمہارا خط مجھے لا دیا۔ میری جانی میں نے تمہارے لئے دعا کی تھی اور خدا نے تمہارا خط مجھے پہنچا دیا۔ میری امّو اس سے مجھے بے حد خوشی ہوئی، میں نے سنت۔ نفل اور دو رکعت شکرانہ ادا کر کے تمہارا خط پڑھا۔ کل صبح میں اس خط کو مکمل کروں گا، اس وقت میں چائے کے لئے پانی گرم کر رہا ہوں۔ خدا حافظ [illegible] توجی!

۲۳ ساڑھے آٹھ ساعت صبح۔

امّو جانی، میری پیاری! حسب دستور صبح چھ بجے اُٹھا، نماز فجر ادا کی، انگیٹھی سلگا کر چائے کی کیتلی اس پر رکھدی اور تلاوت شروع کردی، پھر چائے پی کر نماز اشراق ادا کی، اور تلاوت کلام پاک کے بعد یہ خط لکھ رہا ہوں۔ میں نے تمہارا خط رات دو مرتبہ اور آج ایک مرتبہ پڑھا اور اب اس کا جواب ادا کر رہا ہوں۔

خدا کا شکر ہے کہ سب اچھے ہیں۔ گُم اپنے سُرخ فون پر مجھ سے باتیں کرتا ہے، اور میں بھی اپنے دل کے فون پر اس سے باتیں کرتا ہوں۔ میں اُن چڑیوں کے ذریعہ اس سے باتیں کرتا ہوں جو یہاں کھیلتی رہتی ہیں اور اُن تتلیوں، پرندوں اور کوئلوں کے ذریعہ ذکیہ۔ رضیہ

فوزیہ اور طیبہ سے باتیں کرتا ہوں. جو اڑ کر آتے ہیں اور درختوں پر بیٹھے رہتے ہیں. سب کو سلام خدا حافظ

تمہارا بابا
قاسم

ترجمہ خط مورخہ ۲۸ جنوری ۱۹۴۹ء ۷۸۶/۹۲

۲۳-۱-۴۹ امّو جان - خدا تمہاری حفاظت کرے

۱۱ بجے خط لکھکر تمہیں روانہ کیا، اس کے بعد طبیعت لسپت ہوگئی، کیونکہ تمہارا دوسرا خط آنے تک ذہنی کشمکش کا سلسلہ جاری رہتا ہے - آج ڈاکٹر نے دو ٹیکے لگا دیئے ہیں۔

۲۴/۱ سات ساعت صبح. امّو جانی! ابھی سورج طلوع نہیں ہوا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تم بیدار ہوگئی ہو، اور وہ صبح سویرے کی دو چڑیاں فوزیہ اور طیبہ بھی جاگ گئی ہیں۔ میں نماز فجر اور تلاوت سے فارغ ہوگیا ہوں اور اس وقت چائے پی رہا ہوں.

چار ساعت شام. امّو جی کوئی خاص بات نہیں ہے، بجز اس کے کہ یہاں لال املی فراہم ہوگئی ہے جس کی میں جیلی بنا رہا ہوں۔

۲۵/۱ پیاری امّو جی - ابھی ابھی تمہارا خط ملا، مسرت - شادمانی!! دلکشی!!! اور کیا کیا کچھ ــــــ! امّو تمہارا خط مجھے زندگی بخشتا ہے، اور درمیانی وقفہ اضطراب کا باعث ہوتا ہے ــــــ اشدّ من الموت

پیاری ممّی تمہارا خط کس قدر فرحت بخش ہوتا ہے! لیکن میری امّو ہماری ساری اُمیدیں اور ساری توقعات اللہ اور صرف اللہ سے وابستہ ہیں اُس پر ایمان دراصل ہماری قوت ہے۔ قرآن مجید میں ایک آیت ہے اِن تنصرکمُ اللہ فلا غالب لہٗ۔ یعنی خدا جس کا مددگار ہو اُس کوئی غالب نہیں آسکتا۔ اس لئے ہمیں اُسی کی نصرت پر اعتماد رکھ چاہیئے۔ ہماری مشکلات تکالیف، جدائی، یہ سب گزرنے والی چیزیں ہیں جو دراصل ہماری کمزوریاں ہیں، لیکن ہمیں دلیر ہونا چاہیئے۔ میں جا ہوں کہ انسان کمزور ہوتا ہے۔ بچوں سے جدائی کس قدر تکلیف دہ لیکن ہمیں اس کو برداشت کرنا ہے۔ کیونکہ یہ اللہ کی آزمائش ہو سکتا ہے کہ اس سے زیادہ سخت آزمائشوں میں ہمیں ڈالا جائے ہمیں بہر حال برداشت کرنا ہوگا۔ اس لئے کیوں نہ ہم ان کو خندہ پیشا اور صبرِ جمیلہ سے برداشت کریں۔ خدا حافظ۔

۲۶/۱ ۴ ساعت شام۔ امّو جی! میں اپنے سینے اور پھیپھڑوں کافی حفاظت کر رہا ہوں۔ میں نے روزانہ کا حمام ترک کر دیا ہے کیو سخت سردی پڑ رہی ہے۔ ہر ہفتہ صرف دو مرتبہ دوپہر کو نہاتا ہو صبح کی چائے پر تمہارے علاوہ مجھے حقّہ کی بھی یاد آتی ہے — کل ملاقات ہوگی، اب خدا حافظ۔

۲۷/۱ ۹ ساعت صبح۔ امّو جانی۔ سلام علیکم۔ وہی بات ہے، وہی زندگی وہی صبح اور وہی شام —!

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے   عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

اس شعر میں مایوسی کا رنگ ہے۔ غالب کی زبان میں

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا!

اور میں اپنے سے کہتا ہوں:

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

جب مجھے یہ زندگی بسر کرنا ہی ہے تو میں اسے اطمینان سے کیوں نہ بسر کروں۔ ہنس کر اگر نہیں سکتا تو مجھے رونا ہی کیوں چاہیئے۔ اپنی زندگی کے متعلق نہ میں مایوس ہوں اور نہ پُراُمید، مجھے اس کی کوئی پروا ہی نہیں ہے۔ امّو جی غور کرو کہ پیدا ہونے کے بعد مرنا قطعی امر ہے اور جو قطعی نہیں ہے۔ وہ موت کا طریقہ ہے جس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ کیونکہ ہر علامت استفہامیہ (؟) کے بعد خطِ فاصل (-) کا آنا لازمی ہے!

ساڑھے دس ساعت صبح۔ امّو جانی! ہزار پیار! آج جمعہ ہے اور میں اس خط کو ختم کر رہا ہوں۔ میں اس کے اوپر آخری تاریخ یعنی ۲ جنوری ڈال رہا ہوں۔ امّو جان میں بہت اچھا، بالکل اچھا ہوں۔ کوئی فکر مت کرو۔ سب بچوں کو بہت بہت پیار۔ خدا حافظ۔

تمہارا بابا قاسم

۸۶/۹۲ ۲۷- فروری

عزیزم نور - پیارے بچو - السلام علیکم - خدا تم سب کو بابو کی کامیابی مبارک کرے - وہ بڑا کریم ہے - ایک در بند کرتا ہے تو دس در کھولتا ہے خدا اس کو اپنی حفظ و امان میں رکھے - راہ نیک پر چلائے - اور سعادتمند کرے - اس کو اپنی نصرت سے کامیابی اور کامرانی عطا کرے - آمین بیشک میری تمنا اللہ نے پوری کی وہ اسی طرح مدد کرے گا۔

نورجہاں میری طرف سے فکر نہ کرو - میں یہ نہیں کہتا کہ میں تکالیف و مصائب و آلام میں نہیں ہوں، ہوں اور بہت کچھ ہوں. مگر خدا کی راہ میں ساری تکالیف و مصائب و آلام جھیلنے پڑتے ہیں - ہم تو کیا ہیں - ہمارے سامنے اللہ کے محبوب کی پُر از مصائب و آلام زندگی موجود ہے، ہم تو اُن کی خاکِ پا کے برابر بھی نہیں اور جو مصیبتیں انہوں نے جھیلیں اس کا عشر عشیر بھی ہم نہیں جھیل سکتے، ان کی اور دوسرے بزرگانِ دین کی مثالیں اپنے سامنے رکھو، اور ان کی زندگی سے صبر و شکر کا درس حاصل کرو - ہر مصیبت جو آئے گی وہ گذر ہی جائے گی - آج معلوم ہوا کہ مجھ پر ایک اور مقدمہ چلایا جانے والا ہے - اللہ جانے اور کتنے مقدمے چلائے جائیں گے " این ہم اندر عاشقی " آخر کتنے مقدمے چلائیں گے اور کتنی سزائیں دیں گے - زندگی کے دن تو معین ہیں - اس سے زیادہ تو ہم سزا بھگت نہیں سکتے - پس، جتنا چاہیں انتقام لیں - منتقم حقیقی کا انتقام اِن انتقام لینے والوں کے لئے موجود ہے - اس کی رسی دراز ہے -

اس کے پاس دیر ہے اندھیر نہیں، اس کا انتقام جب شروع ہوگا تو
پھر ان کو پناہ نہ ملے گی۔ ہمارا کام صرف صبر و شکر ہے اس لئے تم
کوئی فکر نہ کرو۔ اس پر بھروسہ کرو، وہ جو کچھ کرے گا اچھا ہی کرے گا
اس نے میرا ساتھ کبھی نہیں چھوڑا اور کبھی نہ چھوڑے گا۔

میری ضروریات کی طرف سے بھی فکر نہ کرو۔ مجھے کسی چیز کی
ضرورت نہیں۔ کپڑے لتے اوڑھنا بچھونا بہرکیف کسی چیز کی ضرورت
نہیں ہے، سب کچھ ہے اور بہت ہے۔

اَمّو جاتی نے بہت دن سے خط نہیں لکھا، اس سے کہو کہ
خط لکھے اور تفصیلی لکھے۔ خدا حافظ

تمہارا قاسم

۷۸۶
۹۲

جیل خانہ ۲۷۔ فروری

میرے پیارے بابو۔ جیؤ، خوش رہو، پھولو پھلو۔ اسلام علیکم۔

تمہاری اماں جی نے تمہارے تار کی کٹنگ میرے پاس بھیجی
جو مجھے آج ملی۔ خدا کا شکر بابا وہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ میرے
دل کی تمنا پوری ہوئی۔ خدا تم کو کامیاب کرے، ہر برائی اور آفت سے
بچائے۔ ہمیشہ تم کو نیکی کے راستہ پر رکھے۔ حق و صداقت کو تمہارا شعارِ
زندگی بنائے۔ سعادت مندی کی تم کو توفیق عطا کرے اور تم کو ایک سچا

اور اچھا مسلمان اور مسلمانوں کا خادم بنائے۔ میرے پیارے میری
کے سہارے، ماں اور بھائی بہنوں کی اُمیدوں کے سہارے، خدا
مہربان ہو۔ ہمیشہ تم کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔

پیارے کاظم تمہاری عمر اب ایسی نہیں ہے کہ تمھیں کسی نصیح
کی ضرورت ہو۔ جب میرے سر سے میرے بابا تمہارے دادا کا
اُٹھا تھا، اس وقت میری عمر بالکل تمہاری عمر تھی، اور تمہارے
اور عباس چچا کی عمریں قریب قریب وہی تھیں جو اب آصف
اور ذکیہ کی ہیں، ہم اس وقت طالب علم تھے اور بالکل بے سہارا ہو
تھے۔ لیکن خدائے کریم نے غیب سے ہماری مدد کی اور ہم کو کبھی ذلی
خوار یا کسی کا محتاج دست نگر یا رسوا و شرمندہ نہ ہونے دیا بابا یہ خ
فضل تھا۔ ہم نے بھی بے وسیلہ ہونے کے بعد جس کردار کی زندگی
وہ ہماری کامیابی کی ضامن بنی۔ ہمارے لئے ایک آسانی ضرور تھی
یہ کہ والد مرحوم نے ہم لوگوں کو چھوٹی چھوٹی عمروں میں اپنے سے عل
کر دیا تھا اور ہمیشہ دور دراز مقامات پر ہم کو خود سے جدا رکھا یہ با
اور یہ تجربہ تم لوگوں کو حاصل نہیں ہوا۔ تم کبھی مجھ سے جدا نہیں
تم کو ابھی دنیا دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ تم کو دنیا کے نشیب و ف
کا تجربہ نہیں، اس لئے چند نصیحتیں کرتا ہوں، بُرا نہ ماننا:

(۱) خدا اور خدا کے رسول کو کبھی نہ بھولنا۔ تمہارا ہر کام خدا کیلئے

(۲) خودداری کو ہاتھ سے نہ جانے دینا، مگر غرور کو کبھی پاس پھٹکنے

(۳) محبت کو اپنا شعار بنانا، بڑوں کا ادب، ہم عمروں سے التفات
چھوٹوں کا لحاظ کرنا۔

(۴) ہر شخص سے میٹھی گفتگو کرنا۔ کسی کو ادنیٰ نہ سمجھنا۔ کسی کے ساتھ
طعنہ وطنز نہ کرنا۔

(۵) ذاتی جوہر نمایش و نمود سے نہ پیدا ہوتا ہے نہ ظاہر ہوتا ہے
نمود و نمایش سے ہمیشہ بچنا، سادگی کو اپنا زیور بنانا۔

(۶) فرض کو ہمیشہ فرض سمجھنا۔ خصوصاً اس زندگی میں جو تم نے اختیار
کی ہے وہ بڑی اچھی زندگی ہے، مگر اس زندگی میں غلط راستہ پر
پڑ کر بہت نوجوان تباہ بھی ہو جاتے ہیں۔ ان برائیوں سے ہمیشہ بچنا
جو اس زندگی کا لازمہ بن گئی ہیں۔ تمہارے ساتھی ممکن ہے کہ طعن
و تشنیع کریں۔ تمہارا مذاق اڑائیں۔ سب کچھ سہنا مگر ان برائیوں سے
بچنا۔ مثلاً اس زندگی کی جو اُم الخبائث ہے وہ شراب ہے، اس کو
کبھی ہاتھ بھی نہ لگانا۔

میرے پیارے خدا تمہیں نیکیوں کی توفیق عطا کرے۔ برائیوں
سے بچائے۔ بابو جان اب تم پر بہت بڑی ذمہ داری ہے، گو ذمہ داری
کا بوجھ اُٹھانے کے قابل ہونے سے پہلے ہی تم پر بوجھ پڑ گیا۔ مگر
اللہ پاک نے بہت جلد تم کو بوجھ اُٹھانے کی صلاحیت دے دی۔
بابا جان اب تم پر ماں۔ بھائی بہنوں کی ذمہ داری ہے، تم میرے
سب سے بڑے نور نظر ہو۔ اور اس وقت میری جگہ ہو۔ اماں کی

اطاعت اور خدمت کو اپنا فرض سمجھو۔ بھائی بہنوں کی محبت تمہارا شعار ر
خدا تمھاری مدد کرے گا۔ تمہاری نیت اچھی ہو تو اللہ برکت دے گ
بابو جان اماں کو کبھی ایک لمحہ کے لئے ناخوش یا ناراض نہ کرن
کیا میں تم سے اِن باتوں کی توقع رکھوں؟
میں نے پھر تم کو خدا کی حفظ و امان میں دیا۔ میرے بابو خدا حافظ

تمہارا بابا

قاسم

۲۸۶
۹۲

۲۱۔ جنوری و اسفندار ۴۹

محترم اباجیا۔ پیاری طاہرہ۔ عزیز نورجہاں۔ میرے پیارے سرد
کاظم، آصف۔ ارشد، عارف۔ ذکیہ، رضیہ، فوزیہ، طیّبہ، نا
فاروق۔ ڈیر احمد۔ اچھی بہن شاہو:

السلام علیکم۔ دعائیں لاکھوں پیار کروں۔

عرصہ دراز کے بعد تم سب کے خطوط عدالت کے توسط
سے ملے، خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تم سب بخیر و عافیت ہو۔ اللہ تم
سب کو اپنی حفظ و اماں میں رکھے۔

پیارو۔ یہ ہم سب جانتے ہیں کہ "کارساز ما بہ فکر کار ما" اور یہ
جانتے ہیں کہ "فکر ما در کار ما آزار ما" لیکن اس کے باوجود ایک د
کی فکر تقاضائے فطرت ہے جو اسی کارساز نے ودیعت کیا ہے۔ بہر کیف

ی اور لاحاصل جاننے کے باوجود ہم ایک دوسرے کی فکر کرتے
تے ہیں، اور جب تک دم میں دم ہے کرتے رہیں گے۔
میرے پیارو، جس خدا نے تم سب کو مجھے دیا اور رشتہ پیدا
اسی خدا نے دلوں کو ایک دوسرے کی محبت سے بھر دیا ہے
ں فکر گویا ہماری دعائیں ہیں جو کارسازِ حقیقی کی بارگاہ میں
ِقت ہماری طرف سے جاتی ہیں۔ وہ دُعاؤں کا سُننے والا ہے۔
اب رہی مصیبت تو اس کا دارو مدار اپنے تصور پر ہے۔ اگر
بھیں تو یہ مصیبت ہے اور اگر غور کریں تو یہی راحت ہے۔ ایک
ہ کہ ہمارا ظرف کم دوسرے یہ کہ عقل کم۔ جس چیز کو ہم بُرا سمجھتے ہیں
ہی ہے کہ خدا کو اس میں ہماری بھلائی مطلوب ہو۔ بہر کیف جب ہم
اس وادی میں قدم رکھا تھا تو یہ سمجھکر رکھا تھا کہ سیر گلستان
نہیں ہے۔ بلکہ گامزنِ خارستان و بیابان ہونا ہے۔ پھولوں کی
پر نہیں کانٹوں کے بستر پر لیٹنا ہے۔ اور یہ سب بخوشی کرنا ہے
د یہ سب آزمائشیں ہیں، ان میں پُورا پُورا اُترنا ہی کامیابی ہے
رمے چلتے رہیں گے۔ فیصلے ہوتے رہیں گے، قیدیں بھگتی جائینگی
ب کچھ ہو گا۔ ہو۔ ہمیں انسانوں کے فیصلوں کی طرف توجہ بھی نہ
چاہیئے۔ کیا انسان اور کیا انسان کا فیصلہ۔ ہمیں اپنے ضمیر
ٹول کر خدا کے فیصلہ کے لئے اپنے اعمال کو چھوڑ دینا چاہیئے
اسی کی عدالت میں سرنگوں ہونا چاہیئے۔ اسی کا فیصلہ سچا اور

اسی کا انصاف حقیقی ہے۔ بہرکیف تم لوگ کسی قسم کی امیدیں قائم نہ کرو۔ اب رہی میری صحت تو تم لوگ اس کی بھی فکر مت کرو۔ موت کا ایک دن معین ہے۔ بیمار اگر موت نہ ہو تو برسوں زندہ رہتے ہیں اور موت آجائے تو بہتر سے بہتر صحت مند ایک ہچکی میں ختم ہو جاتا ہے۔ میں بیمار بھی رہتا ہوں اچھا بھی رہتا ہوں۔ مگر زندہ ہوں اور اگر اسی حالت میں مر بھی جاؤں تو بڑی اچھی موت ہو گی۔ ایسی اچھی موت کہ تم لوگ اس پر فخر کرو گے۔ اور اگر زندہ رہا اور تم لوگوں سے ملنا مقدر ہے تو ملیں گے۔ مگر اس جدائی میں میرے نزدیک ایک بات بڑی اچھی ہوئی، وہ یہ کہ تم کو جو مجھ سے کبھی جدا نہیں ہوئے تھے جدا رہنے کی عادت ہو گئی، اب آخری جدائی کا تم لوگوں کو اتنا صدمہ نہ ہو گا۔

میرے متعلق اگر کچھ سننا تو اس سے پریشان نہ ہونا۔ اسی کو منشاء ایزدی سمجھنا اور صبر و شکر کرنا۔ میں نے تم سب کو خدا کی حفظ و امان میں دیا۔

سب بڑوں چھوٹوں کو جن کو میں نے اس میں مخاطب کیا ہے۔ سلام۔ دعائیں پیار۔ پارٹنر کو سلام پیار۔ راج کو بہت بہت سلام دوسرے تمام جاننے والوں کو سلام۔ ملازمین کو سلام دعا۔ فقط

تمہارا

قاسم

۷- فروری

۲۸۶/۹۲

نوز اور میرے سب پیارو۔ السلام علیکم۔ جیو، خوش رہو، پھولو پھلو
امّو جان کا خط ملا۔ خدا تم سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔
سوچتا ہوں کہ تم لوگوں کو جلد جلد خط لکھا کروں، پھر سوچتا ہوں کہ
کیا لکھوں، لکھنے کے لئے ہے کیا۔ میری زندگی میں صرف صبح ہوتی
ہے شام ہوتی ہے، اور وہ بھی ایک بند کوٹھری کے اندر جہاں نہ
کبھی سورج نکلتا ہے نہ چاند۔ مگر کسی نہ کسی طرح صبح ہوتی ہے اور
پھر شام بھی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح آج تک پانچ سو صبحیں ہو گئیں،
اور اتنی ہی شامیں آئیں۔ ایسی ہی صبح و شام ابھی نہ معلوم کتنی مقدر
ہیں، بظاہر بہت، بظاہر نہیں یقینی بہت۔ مگر جس طرح ایک صبح
کی شام ہو جاتی ہے۔ اسی طرح برسوں کی صبح بھی شام پر ختم ہو ہی
جائے گی۔ اللہ مالک ہے۔

اب رہی تم لوگوں کی حالت۔ بہت کچھ معلوم کرنے کو دل بیتاب
ہوتا ہے۔ پھر سوچتا ہوں کہ بے خبری ہی اچھی۔ اگر تم سب اچھے ہو تو
اچھے ہو اور دل کو یہی کہہ کر اطمینان دلاتا ہوں کہ تم سب اچھے ہو۔
اور اگر خدا نخواستہ کوئی بُری بات معلوم ہو تو اس سے بجز تکلیف
کے اور کیا حاصل۔ اس لئے تم لوگوں کی تفصیلی حالت معلوم کرتے
ہوئے بھی جی لرز جاتا ہے۔ بس تم سب کو خدا کے سپرد کیا وہی تمہارا
نگہبان رہے۔

ابو چل بسا میرے بھائیوں میں میرا سب سے زیادہ ساتھی بچھڑ گیا
اللہ کی مرضی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔خدا اس کی مغفرت کرے۔ وہ
دنیا کی تکلیفوں سے چھوٹ گیا۔ بی اماں سے مل گیا۔ ہم رہ گئے۔ آج
وہ گیا۔ کل ہماری باری ہے۔ یہی ایک چیز دنیا میں یقینی ہے۔ وہ پوری
ہوئی اور ہو گی۔ ناز اور مسلم کو میری طرف سے کلیجے سے لگاؤ۔ مسلم
تو چھوٹا ہے، ناز سے کہو کہ تیرا بابا مرا نہیں زندہ ہے، تو ابو کی نہیں
میری ہے، تو ناز بھی ہے اور ذکیہ بھی ہے۔ ابو کی دلہن کو میری طرف
سے تسلی دو، اور تم سب ابو کی دلہن اور بچوں کو اپنے میں اس طرح
ملا لو کہ فرق نہ محسوس ہو۔ خدا ہم سب کی مدد کرے۔

ابا جیا۔ ناہرہ اور نام بنام سب بچوں کو دعائیں، پیار، اقبال
کو پیار، ڈاکٹر کو سلام، پارٹنر کو پیار۔

میں بس اچھا ہوں، خدا حافظ میرے پیارو

قاسم

۱۷۔ فروری

۷۸۶
۹۲

میری عزیز و پیاری نور جہاں۔ السلام علیکم

تم نے اب تک جس عزم و استقلال، جرأت و ہمت کا مظاہرہ
کیا ہے، مجھے تم سے اسی کی توقع تھی۔ کیوں نہو آخر فاطمہؓ اور خدیجہؓ ہی
کی تو بیٹی ہو۔ تمہاری رگوں میں شہر بانوؓ ہی کا تو خون ہے جس اللہ کی بندی

نے کربلا میں اپنے بچوں کی تڑپتی ہوئی لاشیں دیکھیں اور اپنے اولوالعزم شوہر کا جسم بے سر دیکھا - وہ ماں جس نے اپنے جگر گوشوں کو شہادت کے لئے خود اپنے ہاتھوں سے سجا ہوا اور اُن کی خاک و خون آلودہ لاشوں کو دیکھکر یہ نذر قبول کرنے والے کا شکر ادا کیا۔ نور جہاں صبر اور شکر بھی اللہ کو بہت پسند ہے - ہم کم فہم اور کم ہمت بندے جن کا ظرف بہت چھوٹا ہے اس کی مصلحتوں کو کیا سمجھیں۔ نور، خدا اپنے بندوں کے لئے کوئی بُرائی نہیں کرتا، یہ ہماری فہم کی کوتاہی اور ظرف کی کمی ہے کہ ہم اُس کی آزمائشوں کو مصیبت سمجھتے ہیں۔ نہ معلوم اس میں کیا مصلحت پنہاں ہے، نہ معلوم اس کو ہماری کیا بھلائی مطلوب ہے۔ اس لئے ہمیں ہر آزمائش پر صبر اور آزمائش کے اچھے نتیجہ کی توقع پر شکر کرنا چاہیئے۔ تم نے جن تکلیفوں کا ذکر کیا آخر وہ گذر ہی گئیں، اور آئیں گی تو وہ بھی گذر ہی جائیں گی۔ جس چیز پر ہمارا قابو نہیں اس پر برداشت کے سوا چارہ نہیں۔ اب چاہے ہنس کر گذار دو یا رو کر گذار دو۔ تو پھر کیوں نہ ہر آفت کو ہنس کر گذارا جائے۔ نور جہاں! جو جو مصائب و آلام مجھپر گذرے اور تم لوگوں کے لئے فکر و تردد میں زمانہ گذرا وہ کیسے گذرا، خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن آج دیکھتا ہوں تو یہ زمانہ آخر گذر ہی گیا۔ اس وقت جو گذر رہی ہے اور آئندہ زمانہ نامعلوم تک جو گذرے گی وہ بھی گذر ہی جائے گی۔ خدا کا منشاء پورا ہو کر ہی رہے گا تو پھر کیوں ہم تم اپنے آپ کو خدا ہی کے سپرد نہ کر دیں۔ نور جہاں ہمت و جرأت، صبر و شکر

سے کام لو ابھی نہ جانے کیا کیا مقدر ہے۔ دنیا اور دنیا والوں کا گلہ بے سود ہے۔ دنیا اور دنیا والوں سے کوئی توقع ہی نہ کرو تو اس کے پورے نہ ہونے کا افسوس کیوں ہو۔ ہر برائی کا بدلہ نیکی سے اور ہر بدگوئی کا جواب شیریں دہنی سے، اور ہر بددعا کے بدلے دعائیں دو اور صلہ اور اجر کی توقع خدا سے رکھو۔ تم نے جس ہمت کا مظاہرہ کیا ہے، اس سے بہت زیادہ ہمت کی ضرورت ہے۔ میرے مقابلہ میں بڑی بڑی طاغوتی قوتیں ہیں۔ میری تباہی کے درپئے بڑی بڑی طاقتیں ہیں، ابھی تو امتحان کی ابتدا ہے، انتہا کے لئے میں تیار ہوں، صرف اپنے رب کے بھروسہ پر تیار ہوں، تم کو بھی تیار رہنا پڑے گا، بہت کچھ سہنا پڑے گا۔ میں موہوم امیدوں کا قائل نہیں، حقائق کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ تصویر کے تاریک پہلو اور واقعات کے تکلیف دہ منظر کو کبھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے، اور اس کے بعد بارگاہِ کریم سے لَو لگانا چاہیئے، تاکہ اگر بعد کو کوئی تکلیف دہ بات ہو تو دل پر اس کا زیادہ اثر نہ ہو میرا خیال یہ ہے کہ ان مقدمات میں مجھے کم از کم دس سال سزا دیجائیگی اور نہ معلوم کہ کتنے اور مقدمے کھڑے کئے جائیں گے۔ یہ تم کو اس لئے لکھ رہا ہوں کہ بعد کو تمھیں صدمہ نہ ہو۔

میری جدائی سے تم کو اور پیارے بچوں کو جو تکلیف ہے اور ہوگی، ظاہر ہے، مگر یہ ہمارے بس کی بات تو ہے نہیں اس لئے ہمیں صبر ہی کرنا چاہیئے نور جہاں تمہارا مجھ سے ملنے یہاں آنا یا کسی بچے کا آنا خالی از خطرہ نہیں۔

دوم یہ کہ مجھ سے ملنے نہ دیا جائے گا۔ سوم یہ کہ جس حال میں ہوں اس حال میں مجھ سے ملنے سے نہ ملنا بہتر ہے۔ رنج کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ خدا ملانے والا ہے، اُس پر چھوڑو جب اُسے منظور ہوگا، اچھی حالت میں خوش و خرم ملائے گا۔ تم سب اس طرف رُخ کرنے کا بھی خیال دل میں نہ لاؤ۔ یہ مقدمات کا ڈھکوسلہ ایک مہینے کے اندر ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد دوسری منزل شروع ہوگی۔ اللہ مالک ہے، صبر کرو صبر کرو۔
نور جہاں خدا حافظ، انّ اللہ مع الصابرین۔

تمہارا
قاسم

نور میری عزیز و باہمت نور۔ اس اظہار حقیقت سے رنجیدہ اور پریشان نہ ہونا۔ غور کرو اور خوب غور کرو۔ جب میں تم لوگوں کے ساتھ تھا، اُس وقت تمہارا اور ہمارے بچوں کا محافظ اور پالنے والا کون تھا۔ میرا محافظ اور پالنے والا کون تھا۔ نور جہاں میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں مگر وہ حافظ و ناصر وہ رزاق و کریم تمہارے ساتھ ہے اور میرے ساتھ بھی۔ ذرا سوچو اگر اس نے مجھ کو اسی وقت اُٹھا لیا ہوتا تو کیا ہوتا۔ وہی ہوتا جو اب ہو رہا ہے۔ یعنی اسی طرح وہ تمہارے ساتھ ہوتا۔ جس طرح اب ہے۔ نور حقیقی وسیلہ تمام ظاہری وسائل کے باوجود ذہنی ہے۔ اللہ بس باقی ہوس، دل مضبوط رکھو، تم پر اب بہت بڑی ذمہ داری ہے

انشاء اللہ وہ فریاد سننے والا میرے ننھوں کی فریاد سنے گا، میرے ننھے
سے فاروق کا ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگنا خالی نہ جائے گا، اس پر کامل بھروسہ
اور یقین رکھو، خدا حافظ. فقط تمہارا

قاسم

میرے پیارو نور - سرور - کاظم - آصف، ارشد - عارف - احمد - ناز - ذکیہ
رضیہ - فوزیہ - مسلم - طیبہ - ناصر - فراق - پیاری اقبال - اچھے اباجیا
جانم طاہرہ - عزیزم شاہو - قابل عزت ومحبت راج اور سب عزیزو -
السلام علیکم - عید کی مبارکباد ذریعہ تار بھیج چکا ہوں - مکرر سب کو
عید مبارک - پیارو تمہارا عید کی دعاؤں کا تار ملا جس میں تم نے لکھا تھا
تمہاری حقیقی عید اس وقت ہو گی جب مجھ سے ملو گے - نہیں نہیں میرے
پیارو - خدا کی راہ میں تمہارے عزیز اور بابا کا ایک ایک لمحہ جو مصیبت نما
راحت میں گذر رہا ہے وہ تمہارے لئے عید ہونا چاہیئے - خدا کی طرف
سے جو آزمائشیں ہوتی ہیں وہ مصیبت نہیں ہوتیں - یہ خوش نصیبی ہے کہ
وہ مجھ کو اپنی آزمائشوں کے قابل سمجھ رہا ہے . یہ سعادت پیغمبروں اور
صالحوں کی تقدیر ہوا کرتی ہے . اگر میرے مالک نے مجھ ناچیز حقیر گنہ گار
بندے کو اپنی آزمائشوں کا اہل تصور فرمایا تو یہ اُس کی عین نوازش ہے
اس سے بڑھکر اور کیا چیز قابلِ فخر ہو سکتی ہے . پیارو دوست ہی دوست کو
آزماتا ہے - اگر میرا پیارا مالک مجھے آزما رہا ہے تو یہ ثبوت ہے اس بات کا

وہ مجھے اپنا دوست سمجھتا ہے، مجھے اور کیا چاہیئے۔ اللہ اللہ میرا اللہ مجھے دوست سمجھے، بچو مجھے دین و دنیا دونوں مل گئی۔ تم بھی خوشی کرو کہ تمھارا بابا دنیا میں آزمایا جارہا ہے، اور جس قدر دنیا میں مایا جائے گا اتنا ہی آخرت کا بوجھ کم ہوگا۔ مجھے مبارک باد دو۔

تمہارے سب تار بابو کا خط اور تصویر۔ ارشد کا خط مجھے عید کے دن دیئے گئے، گو پہلے سے آئے ہوئے تھے، اس کے بعد آج آتو جانی کا اور بابو کا خط ملا۔

بابو کی تصویر دیکھکر دل پر سے بوجہ فطرت انسانی جو بوجھ تھا وہ اتر گیا۔ بس میں اللہ کا شکر کرتے ہوئے ایک حد تک مطمئن ہو گیا۔ خدا نے اپنے فضل سے تم سب کو میرا ایک جانشین دے دیا، خدا اس کو اپنے صراطِ مستقیم پر رکھتے ہوئے با اقبال کامران و شادکام کرے۔ ابتک مینے فاروق سے باتیں کرلیا کرتا تھا۔ اب بابو جیا سے بھی باتیں ہوتی ہیں۔ اور اگر مینے فاروق میرے تصور میں کوئی شرارت کرتے ہیں تو میں ان سے کہتا ہوں کہ کیوں بابو بھائی سے مار کھلواؤں۔ بہرکیف دونوں تصویریں میری میز پر ہیں اور مزے میں گذرتی ہے دوسری تصویر جس میں سب بچے ہیں۔ اس کو قرآن شریف میں بند رکھتا ہوں اس لئے اموجی اس میں ہیں اور اس کو کھلا رکھنا نہیں چاہتا۔ صرف صبح میں قرآن شریف پڑھتے وقت سب سے علیک سلیک ہو جاتی ہے۔

ایک مقدمہ شعیب اللہ میں بحث شروع ہو گئی ہے آج دوسرا دن تھا غالباً ۸ دن اور میں بحث کروں گا - اس کے بعد جو بھی فیصلہ ہو" ہو" مجھے اس کی پرواہ نہیں - بی بی نگر کیس میں اس کے بعد بحث ہوگی، ابھی اس میں کچھ شہادت باقی ہے - بہرکیف اندازہ یہ ہے کہ ایک مہینہ میں ان دونوں مقدمات میں فیصلے ہو جائیں گے - کیا فیصلے ہوں گے ان کی نہ میں پرواہ کرتا ہوں نہ تم کرو - میری اچھی گذر رہی ہے تنہائی ہے، میرے ساتھ صرف میرا اللہ ہے اور اس سے بڑھکر مجھے کسی ساتھی کی ضرورت نہیں ہے میرے لئے "اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا" سے بڑھکر اور کیا چاہیئے - فقط خدا حافظ

تمہارا

قاسم

۸ - اگست سنہ ۱۹۵۰ء

عزیز نوز میرے پیارے بچے - السلام علیکم

ایک مشغلہ حمیہ کو ختم ہوا دوسرا کل سے شروع ہونے والا ہے - دن رات بحث کی تیاری میں گذر رہے ہیں، میں اُن کا مشکور ہوں کہ جنھوں نے مقدمے چلاکر یہ دلچسپی کا سامان میرے لئے مہیا کر دیا ہے جب تک قید میں ہوں اسی طرح مقدمے چلاتے رہیں تو تیاری کا مشغلہ ہاتھ آئے اور مشغولیت رہے اور بیکاری کی کلفت نہ ہو - میں ہر مصیبت میں راحت اور ہر تکلیف میں آرام پا رہا ہوں - یہ بھی خدا کی مہربانی ہے

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

یوں تو میں نے راحت کو کبھی راحت نہ سمجھا تھا، مگر شکریہ مصیبت میں ڈالنے کی کوشش کرنے والوں کا کہ انھوں نے مصیبت کا عادی بنا کر احساس تکلیف بھی گم کر دیا۔ بڑی مزے سے گزر رہی ہے، دوسرے ساتھی جب تھے تو ہم بدنصیب اللہ سے دور تھے، شکر ہے کہ دوسرے ساتھی دور ہوئے تو اب ہم اللہ سے نزدیک ہو گئے۔ تنہائی کا وہی ساتھی ہے، غم میں غمگسار، بہرکیف نہ تنہائی تنہائی ہے نہ غم غم نہ تکلیف تکلیف۔ اللہ کا شکر اُس کی مہربانی۔

ایک مشغلہ تم نے بھیج دیا، وہ اَن دیکھے فاروق کی تصویر اور رابعہ مارشل بابو جان کی تصویر ہے۔ دن رات میز پر بیٹھکر کام کرتا ہوں، دونوں کی تصویریں سامنے ہیں۔ ذرا لکھنے پڑھنے سے سر اُٹھایا، دونوں سامنے آ جاتے ہیں، اور ان سے باتیں شروع ہو جاتی ہیں، صبح اُٹھکر ان سے سلام علیک ہوتی ہے رات کو خدا حافظ ہوتا ہے۔ فاروق میاں بہت شرارت کرتے ہیں تو بابو بھائی کے حوالے کئے جاتے ہیں، بہرکیف اس میں بھی مزہ آتا ہے۔ بڑی مزہ کی زندگی ہے نور۔

خدا تم سب کا حافظ و ناصر رہے۔ آمین بجاہ سید المرسلین

تمہارا

قاسم

مورخہ ۱۴۔ اگست سنہ ۱۹۵۰ء

نورم، نورِ خانہ ام، نورِ دلم اور میرے سب نورِ چشم عزیزو۔ دوستو۔
السلام علیکم،

نور۔ امو جانی۔ پیارے بچو۔ جیو خوش رہو۔

دیکھو نور، ایسی باتوں کی سیکھ نہیں، یہ کیا "پریشان حال نور" "حیران نور" کیا تم وہی نور نہیں ہو جو اس وقت جب میں ملت کے لئے حیران و سرگرداں جنگل جنگل بیابان بیابان مارے مارے پھرا کرتا تھا۔ اور تم ایک شیرنی کی طرح یکہ و تنہا اپنی کوئی میں درندوں میں گھری ہوئی اپنے بچوں کی حفاظت کرتی رہتیں اور کوئی کا چکر لگایا کرتی تھیں۔ نہیں نور، رضوی کی ۲۴ سالہ شریکِ زندگی کو ایسی کمزوری کی باتیں نہ کرنا چاہیئے۔ میں گو کٹہرے میں ہوں مگر مزے میں ہوں۔ اور دوسری طرف یہ اطمینان ہو گیا ہے کہ شیر بچے اب اپنی شیرنی ماں کی حفاظت اور خدمت کے قابل ہو گئے ہیں۔ مجھے اور کیا چاہیئے نور، فکر مت کرو۔ اللہ کی مرضی پوری ہو کر رہتی ہے، اس لئے اس پر نہ شکوہ چاہیئے نہ شکایت، نہ حیرانی نہ پریشانی، یہ سب منجانب اللہ ہے اور جو اللہ کی طرف سے ہوتا ہے وہ اچھا ہوتا ہے۔

اب تک میری میز پر بابو بھائی اور توتے منو بیٹھے رہتے تھے۔ کل تمہارے دو خطوں میں باشاہ بھائی اور چنو بھائی بھی آ گئے۔ اب تک توتے منو سے باتیں ہوتی تھیں، اور بابو سے کیا جاتا تھا کہ دیکھو توتے منے ستارہے

ہیں ذرا ان کی خبر لو، مگر بابو بھائی تو بڑے بھائی ٹھہرے، وہ کچھ بھی خبر نہیں لیتے ہیں۔ اب چنو بھائی سے کہتا ہوں مگر وہ بھی بہت شریف آدمی ہو گئے ہیں، وہ بھی توتے سے منے کو کچھ نہیں کہتے۔ البتہ باشاہ بھائی ذرا آنکھیں نکال کر "ہوں" کہہ دیتے ہیں مگر منو منے بہت شریر ہیں وہ کب پرواہ کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں "بابا میں تو ابھی منے منے ہیں میرے تو یہ بھایاں تجھ بھی نہیں تلتے باباتی حماتہک ہوا تھی" اب گلم کی کسر ہے اسی سائز کی ایک تصویر گلم کی بھی بھیجدو شاید وہ آکر کچھ "بہاوت" میاں کو ٹھیک کریں ورنہ پھر 'جتو ماں' کو بلانا پڑے گا۔

اچھا کام بہت ہے نام بنام پیام اور سلام نہیں لکھ سکتا سب کو کروڑوں پیار۔ سلام۔ آداب۔ فقط تمہارا

قاسم

میرے پیارے ارشد، میرے پیارے بچے میرے نور نظر میرے لخت جگر، خدا تجھے خوش رکھے، میرے لئے بے چین ہونے والے، میرے لئے دعائیں کرنے والے خدا تیرا حافظ و نگہبان رہے، تجھے باایمان با اقبال و بامراد رکھے۔ آمین۔

السلام علیکم۔ ارشد پیارے تیرے تین خط ملے، اور میرا ہر خط سب کا نام بنام موسومہ ہوتا ہے۔ مگر تونے لکھا ہے کہ میں اس کا جواب دوں، اس لئے میں تجھے علحدہ یہ خط لکھ رہا ہوں۔

پیارے میں تمہارے لئے کیا فکر کر سکتا ہوں، اور میری فکروں میں ہوتا کیا ہے۔ ایک فکر کرنے والا ہے جو تم سب کی فکر کر رہا ہے اور میں مطمئن ہوں:"

"کار سازِ ما بفکرِ کارِ ما   فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما"

اب رہی میرے لئے تمہاری فکر تو تم بھی فکر نہ کرو جو تمہاری فکریں کر رہا ہے وہی میری بھی فکر کر رہا ہے۔ میرے دیوانے بچے، مقدمے، مقدموں کی پیروی، مقدموں سے چھوٹنا یہ سب بڑی معمولی باتیں ہیں، ہمیں تو اس مقدمے کے لئے تیار ہونا ہے جہاں نہ ہماری پیروی کام دے گی نہ حجت کی باریکیاں کام دیں گی۔ وہ عدالت ایسی ہوگی جہاں کوئی وکیل بھی پیروی نہ کر سکے گا۔ قوموں اور ملتوں کے بڑے وکیل جن کو پیغمبری کے مرتبے حاصل تھے وہ بھی "نفسی نفسی" پکاریں گے۔ جہاں ہمارے ہاتھ پاؤں۔ آنکھ۔ ناک۔ کان۔ منہ ہمارے خلاف گواہی دیں گے۔ ہمیں اس مقدمے اور اس مقدمے کے نتیجے کی فکر کرنا ہے۔ اگر کوئی اطمینان ہے تو صرف اس کا کہ اس بڑی عدالت کے جج نے فرمایا ہے، اور وہ بھی ہمارے پیارے وکیل کے ذریعہ سے جو رحمۃ اللعالمین ہے۔ فرمایا ہے کہ "یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسھم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا۔ انہ ھو الغفور الرحیم۔ (ترجمہ: اے میرے وہ بندو جنھوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا ہے (یعنی گناہ کئے ہیں) اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو۔ اللہ تمام گناہ بخش دے گا۔ وہ غفور اور رحیم ہے")

بس اس غفور الرحیم کے اس مژدہ سے تقویت ہے اور رحمۃ للعالمین کے جو ہمارا وکیل ہے "اُمتی اُمتی" پکارنے سے یقین ہے کہ اُس مقدمہ سے برائت حاصل ہوگی۔ خدا ہم کو اپنے پیارے رسول کے صدقے میں اُس مقدمے سے بری کردے تو بس ہے۔

ان مقدمات کی پیروی، تیاری اور بحث تو صرف اس لئے کر رہا ہوں کہ کچھ دل بہل جائے اور کچھ وقت کٹ جائے۔ میرے لئے یہ مقدمات وقت گذارنے کے لئے بڑا اچھا مشغلہ ہے۔ نتیجہ، تو نتیجے کی نہ مجھے فکر ہے نہ پرواہ۔ تم نے لکھا ہے کہ یہ مقدمات خارج ہو جائیں اور میں بری ہو جاؤں، اگر ایسا ہوا تو بھی میرے لئے کوئی خاص بات نہیں۔ البتہ پیغمبروں کی ایک سنت سے میں محروم ہو جاؤں گا۔ میں تو چاہتا ہوں کہ یا تو مجھے حضرت یوسف کی سنت کی تکمیل کا موقع ملے اور اُن کی طرح مقدمہ چلانے والے مجھے سزائے قید دیں یا پھر حضرت عیسیٰ کی سنت ادا کرنے کی سعادت ہو کہ مقدمہ چلانیوالے اُن کی طرح مجھے پھانسی پر چڑھا دیں۔ پھر یہ سعادتیں پیغمبروں کا مقدر ہیں۔ اگر ہم کو نصیب ہوں تو اللہ کا شکر۔ خدا کی راہ میں یہ سعادت اللہ اللہ اگر یہ تمہارے بابا کا مقدر ہو جائے تو تمہاری اور تمہاری آنے والی نسلوں کے لئے فخر کرنے کے واسطے ایک بہت بڑی بات ہوگی۔ دعا کرو کہ خدا تمہارے بابا کا جسم اور جان دونوں اپنی راہ میں قبول فرمالے۔ آمین۔

تم پڑھ رہے ہو، اچھی طرح پڑھ رہے ہو، خوشی ہوئی، خدا تمہیں پڑھا لکھا کر فاضل بنائے، اور ملت کی خدمت گذاری کی توفیق عطا کرے اماں جی کو سلام علیک اور سب بھائی بہنوں کو دعائیں پیار۔ ابا جیا، پھوپھاں اور سب چچاؤں کو سلام علیک۔ اقبال پیاری کو پیار، اور سب، دوست احباب عزیز و اقربا کو سلام مسنون۔ سب ملازموں کو سلام مسنون۔

ایک اور خط اس کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ وہ بابو بھائی کے پاس بھجوا دو۔ خدا حافظ

تمہارا بابا
قاسم

۲۰۔ اگست سنہ ۱۹۵۰ء

میرے پیارے چنو بابا۔ لاکھوں دعائیں، لاکھوں پیار۔

تمہارا خط ملا۔ خدا تمھیں خوش رکھے، تم اچھی طرح پڑھ رہے ہو۔ پڑھو لکھو کامران و کامیاب ہو۔ تمہارے متعلق سردار آپا نے جو کچھ لکھا اس کو پڑھکر بڑی خوشی ہوئی۔ جانی ہونہار بچے ایسے ہی ہوتے ہیں، مجھے تم سے ایسی ہی سعادت مندی کی توقع تھی۔ خدا تمھیں ہمیشہ سعادت مند رکھے۔ سعادت مندی اقبال مندی کی دلیل ہے۔ اماں کی خدمت گذاری، بڑے بھائی بہن کی اطاعت گذاری، چھوٹے بھائی بہنوں پر شفقت یہی تمہارا اشعار ہو

انشاء اللہ تم دنیا میں کامیاب و کامران رہو گے۔ دعائیں تمہارا بابا
قاسم

احمد پیارے۔ جیو۔ سب بچوں نے مجھے لکھا تم نے کیوں نہیں لکھا
تم سے شکایت ہے۔ آئندہ سب بھائی بہنوں کے ساتھ تم بھی لکھا کرو۔
خوب دل لگا کر پڑھو۔ تمہارا بابا قاسم

پیاری میری نازو۔ اللہ تجھے خوش رکھے، کیا تو بڑے بابا کو
بھول گئی۔ سب نے لکھا، تو نے کیوں نہیں لکھا، اس کی سزا میں ذکیہ کو لکھتا
ہوں کہ وہ تجھے اتنے پیار کرے کہ تیرے گلّے لال ہو جائیں۔ آئندہ ذکیہ
کے ساتھ ہمیشہ مجھے خط لکھنا۔ تیرا بابا قاسم

پیاری میری ذکو منی۔ جُگ جُگ جیو۔ تو وہاں "پڑھتے ہیں" یہاں بہاں
خوش ہوتے ہیں" خوب پڑھو اچھا پڑھو۔ ہاں ناز کو میری طرف سے
یہ سزا دو کہ پیار کر کے اس کے گلّے لال کر دو۔ حکو منی یہ تو بتاؤ کہ
لجو ماں سے دوستی ہے یا کُھٹّی ہے۔ دیکھو بھیا اب کھٹّی کی سکیں نہیں
میرے لئے دعائیں کرنے والی میری منی میں تیرے لئے دعائیں کرتا ہوں
میں اچھا ہوں، تم اپنے سب چھوٹے بھائی بہنوں کا خیال رکھو۔ سب سے
شفقت سے پیش آؤ۔ خدا تم کو با اقبال کرے۔ تیرا بابا قاسم

میری ہرنی اجنٹہ کی پتلی رہنو۔ تیری آنکھوں کو ہزاروں پیار۔ مجھے اسی طرح خط لکھا کرو اور سب سے لکھوایا کرو۔ میرے لئے دعائیں کرنے والی تیری دعائیں اللہ قبول کر رہا ہے۔ میں اچھا ہوں اور انشاءاللہ اچھا رہوں گا۔ تم میری فکر نہ کرو۔ خوب پڑھو لکھو۔ اقبال آپا کو پیار، ابا جیا کو آداب

تیرا بابا قاسم

میری چھگی نوزی منی، بہت بہت پیار۔ تیرا پیار بھرا خط ملا۔ جیو میری یاد کرنے والی خوش رہو۔ تو مجھ سے ملنے اتنی بے چین کیوں ہے۔ بس یہ سمجھ لے کہ میں دورے پر ہوں۔ انشاءاللہ ملیں گے۔ فکر مت کرو خوب جی لگا کر پڑھو۔ سرور آپا کی طرح پڑھ لکھ کر قابل بنو۔ اماں کی خدمت کرو۔ میں اچھا ہوں۔ فقط تیرا چھگا بابا

قاسم

Muchi Baba my darling Sony. Love Kisses. Doa, Never call me chacha, Call me Bare Baba or only Baba. I hope you are going to school. Work hard and play well. Love to Mammy. Your Baba KASIM.

میری کو یلیا طیو جانی ۔ میری ننھی نمازن ۔ تو نماز پڑھکر میرے لئے دعائیں کرتی ہے میں بھی نماز پڑھکر تیرے لئے دعائیں کرتا۔ اللہ تیری میری دعا ضرور سُن لے گا۔ تو اب بھی پیارا پیارا گانا گاتی ہے یا نہیں۔ تیرا پیارا پیارا خط پڑھکر بہت خوشی ہوئی ۔ اسی طرح خط لکھا کرو۔ پیار دعا

تیرا بابا قاسم

کم پیارے۔ پیار پیار لاکھوں پیار ۔ تم نے مجھے خواب میں دیکھا اچھا بتاؤ میں کیا کر رہا تھا ۔ میں تم کو پیار کر رہا تھا ۔ میں تم کو ہر وقت دیکھتا رہتا ہوں ۔ تم بڑے پیارے بچے ہو ۔ اسی طرح ہمیشہ خط لکھا کرو اچھا یہ تو بتاؤ کہ تمہاری موٹر سیکل اب بھی چلتی ہے یا "پتلول تھتم ہو دیا" دیکھو۔ دیکھو موٹر سیکل روکنا نہیں خوب تیز چلاؤ ۔ خواجہ تم کو بہت یاد کرتا ہے اور کہتا ہے "تیلی......." اور بہت بہت پیار کہتا ہے۔ اچھا" تھدا حافج"

تمھارا بابا قاسم۔

چھوٹے چھوٹے منے منے فاروق پہوال ۔ تم کو "ممی چل" سے فرصت ہنو گی ۔ اسی لئے تم نے خط نہیں لکھا ۔ تم نے نہیں لکھا تھا تو اپنی ممی سے لکھوا دیتے ۔ اب اپنی ممّی سے کہو "ممّی لکھ ۔ بابا لکھ" ممی کو دعائیں سلام

تیرا بابا قاسم

By Air Mail

To. Begam Qaseem Razaee
Aziz Manzil, Robson Road
Karachi No 4 (PAK)

Special Jail
Irimalgire

میری پیاری بچی - السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ - الحمد للہ خداوند نے میری [illegible] قبول ہوئی - اس کا لاکھ لاکھ شکر -

اب حقیقی معنوں میں [illegible] کی تکمیل شروع ہوئی - [illegible] سنت محمدی کی تعمیل ہو رہی ہے - یا ایھا المزمل کی عملی شکل نظر آ رہی ہے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]



پیارے پاشا بھائی - دعائیں پیار - تم خط کیوں نہیں لکھتے - میں
اچھا ہوں اور تمہاری ذات سے بڑی بڑی توقعات رکھتا ہوں، مجھے
تم میں بڑے جوہر نظر آرہے ہیں - خدا میری تم سے وابستہ اُمیدوں کو
پُورا کرے ، اور تم کو چراغ خاندان بنا کر چمکائے - بابا

"نگہ بلند - سخن دل نواز - جاں پُرسوز"

رکھو - انشاء اللہ زندگی میں کامیاب ہوگے - اماں کی خدمت اور بھائی
بہنوں کی محبت تمہارا شعار رہے - ماں کے پیروں کے نیچے جنت ہی نہیں
بلکہ بچے کی ساری کائنات ہے - صرف خدا ماں کے سر پر ہے اور ساری
کائنات پیر کے نیچے - مقاصد اعلیٰ رکھو ، تمہارا سطح نظر کیا ہونا چاہیئے
تم خوب واقف ہو - انشاء اللہ - خدا حافظ

تمہارا بابا قاسم

---

۲ - ستمبر ۱۹۵۰ء

میری امو جانی رمیری نور نظر ، میری لخت جگر میرے دل کا سکون -
السلام علیکم - امو کیا تو سمجھتی ہے کہ میں کچھ نہیں سمجھتا - کیا میں
سب کی فطرتوں سے واقف نہیں - کیا مجھکو سب کی طبیعتوں کا اندازہ نہیں
جو کچھ میں نے لکھا سب کچھ جانتے ہوئے سب کچھ سمجھتے ہوئے لکھا
میں جانتا ہوں کہ عجیب و حیرانی طبیعتوں کو " مصائب و آلام نے کڑوے
کریلے پر نیم چڑھا کر دیا " ہے - امو جانی ہر طبیعت اور ہر فطرت جادۂ اعلیٰ او

ظرف کامل نہیں رکھتی۔ تمہیں ہر فطرت کو اسی معیار پہ نہ جانچنا چاہیئے۔
ہر کس و ناکس سے یہ توقعات نہ رکھنی چاہیئے۔ فطرت انسانی کی عام
کمزوریوں کو ملحوظ رکھو۔ البتہ خود کو اعلیٰ سے اعلیٰ ظرف اور مضبوط سے
مضبوط جادہ کا حامل و پابند بناؤ۔ یہ کسوٹی میرے پیارے بچوں کے
لئے ہے۔ میری پچیس سالہ شریک زندگی کے لئے ہے دوسروں کے لئے
نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے صبر و سکون کو انتہائی حدوں تک
آزمایا گیا ہوگا۔ تمہارے تاب و توانائی کو برداشت کی انتہا تک پہونچایا
گیا ہوگا، مگر میرے فطرت کے مجسمو میرے خون کے ٹکڑو! تمہارے صبر
و سکون کی نہ کوئی حد ہونی چاہیئے نہ تاب و توانائی کی کوئی انتہا۔ جو دوسروں
کے لئے انتہا ہو وہ تمہارے لئے ابتدا ہو۔ میرے بچو! حسین ابن علی
کے پوتو۔ محمد عربی کے نواسو! تمہارے لئے یہ تین نمونے ہیں۔ تمہارے
باپ نے کبھی برائی کا بدلہ برائی سے نہ دیا۔ تمہارے دادا نے سر لینے
والوں کو دعائیں دیں۔ تمہارے نانا نے ظلم کا بدلہ رحم سے دیا۔ میرے
پیارو اگر تم ان کی حقیقی اور سچی اولاد ہو اور خدا کی قسم تم ہو تو پھر
ان کے عمل کو نمونہ بناؤ۔ میرے بچو ظلم کی انتہا بھی انتقام کے لئے جواز
نہیں پیدا کرتی۔ برائیوں کی فراوانی ہم کو برا بننے کی اجازت نہیں دیتی
انتقام اسی منتقم حقیقی کی قدرت میں ہے۔ ہمارا کام ہر ظلم ہر تکلیف
ہر برائی پر صبر اور صرف صبر کرنا ہے اور اس کا بدلہ رحم اور نیکی اور
بھلائی سے دینا ہے۔ یاد رکھو "ان اللہ مع الصابرین" اللہ صبر کرنے

والوں کے ساتھ ہے۔ صبر میں شکر داخل ہے اور شکر میں احسان اس لئے تم صبر و شکر و احسان کرو۔ میرے بچو میں تم سے استدعا کرتا ہوں کہ میری نصیحت پر عمل کرو۔ جاؤ اور سب کو سمیٹ لو۔

امو جانی، اچھوں کے تو سب ہوتے ہیں بُروں کو اپنانا اور اپنا کر اچھا بنانا ہی سب سے بڑی نیکی اور اچھائی ہے۔ جاؤ خدا کے لئے جاؤ۔ اپنے بابا کے سکونِ قلب کے لئے جاؤ اور اپنے سب کو سمیٹ لو خدا تمہاری مدد کرے گا۔

ہاں آج بی بی نگر کے مقدمہ کی بھی بحثیں ختم ہوگئیں۔ اب ۵ تاریخ کو فیصلہ کی تاریخ مقرر ہوگی جو غالباً ۸۔ یا ۱۰ روز کی ہوگی۔ اور اس روز دونوں مقدموں میں فیصلہ سنایا جائے گا۔ فیصلہ کیا ہوگا اس کی نہ مجھے فکر نہ فکر کی ضرورت۔ "ہورہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا" اور تم لوگ بھی اس کی فکر نہ کرو۔ جو کچھ ہوگا خدا کی مرضی سے ہوگا اور خدا کی مرضی سے جو کچھ ہوگا اچھا ہی ہوگا۔ البتہ میری دلچسپی کا یہ مشغلہ تھا ختم ہوا۔ اب تیسرا مقدمہ شروع ہونے والا ہے، دلچسپی کا سامان پھر ہاتھ آجائے گا۔

میری امو تیرا بابا

قاسم

۴۔ ستمبر ۱۹۵۱ء

عزیز لوز پیارے بچو۔ السلام علیکم۔ تم سب کی خیریت

پیارے ارشد کے خط سے یا کامل سے معلوم ہوتی رہتی ہے۔ خدا تم
سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ میں

جس حال میں ہوں وقفِ تماشائے ادا ہوں
جس رنگ میں ہوں ماتمیِ رنگِ وفا ہوں

اچھا ہوں۔ مزہ میں ہوں۔ حقیقی زندگی کی اصلیتیں اور قدریں معلوم
کر رہا ہوں۔ ماں باپ بچوں کو تعلیم و تربیت کے لئے اپنے سے الگ
کر کے بھیجدیا کرتے ہیں۔ تم لوگ یہ سمجھ لو کہ تم لوگوں نے مجھکو ایک مخصوص
تعلیم و تربیت کے لئے اپنے سے الگ کر کے بھیجدیا ہے۔ اور بس۔
نور مجھے تم سے ایک خاص بات کہنا ہے خدا کرے کہ یہ بات تم تک
بغیر کٹے پھٹے پہونچ جائے۔ نور! افراد اور افراد کی زندگی قوموں اور
قوموں کی حیات کے مقابلہ میں، ہیچ بلکہ کچھ نہیں ہوا کرتیں۔ دیکھو میری
ذات میری حیات میری ممات کو دو ملکوں اور دو قوموں کے درمیان
کسی طرح سے بھی بدمزگی کا سبب نہ بننے دو۔ دیکھو ہر دو بہت بھگت
چکے ہیں اور اگر اس بھگتان میں اضافہ کیا گیا اور اس اضافہ کی
وجہ میری ذات بنائی گئی تو مجھے بہت صدمہ ہوگا۔ میں تم سے
خدا کو حاضر و ناظر جان کر تمھیں یقین دلا کر کہتا ہوں کہ میں جس حال
میں بھی ہوں مجھے اب اس میں لطف آنے لگا ہے اس لئے تم اور
بچے میرے لئے متفکر نہ ہو اور اپنی پوری قوت اس پر صرف کر دو کہ
میری ذات لاکھوں کروڑوں کی حیات کی بدمزگی کا باعث نہ بنے۔

یہ میری تم سے استدعا ہے، خواہش ہے، حکم ہے۔ تمہارا سب کا اللہ حافظ

تمہارا قاسم

۲۷۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء

میرے پیارے ارشد۔ جیو خوش رہو۔ تمہارا ۲۲۔ اکتوبر کا خط کل ملا آج جواب لکھ رہا ہوں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر کہ تم سب بھائی بہن اور اماں اچھے ہیں۔ سب کو میری دعائیں سلام۔ پیار۔ تم کو میں نے اللہ کی حفظ و امان میں دیا ہے وہی تمہارا حافظ و ناصر رہیگا۔ میری طرف سے بالکل متفکر نہ ہو۔ میرا تو وظیفہ یہ ہے کہ "ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العالمین لا شریک لہٗ" تو پھر کسی فکر کی کیا ضرورت

تم نے میری نصیحت کے جواب میں جو کچھ لکھا، اس سے مجھے نہ صرف تسلی ہوئی بلکہ میں تم سب پر فخر محسوس کرتا ہوں، مجھے تم سب سے یہی اُمید تھی، خدا تم کو ہمیشہ باایمان باکردار اور اُلو العزم رکھے۔ تمہاری دنیا اور دین دونوں بنادے۔ "ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃً وّفی الاٰخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار"

لیاقت علی خاں کا سوگ تم لوگوں نے منایا ہم نے بھی منایا۔ تم تعجب کروگے کہ ایک جیل کا قیدی کس طرح سوگ منا سکا ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس دن ہماری جیل نے سوگ منایا تھا۔ جیل پر ہندوستانی جھنڈے کو ہاف ماسٹ کیا گیا تھا جو سوگ کی علامت ہے۔ یہ تو ہم نے اپنی قید کی کوٹھری

میں سے دیکھا اور سنا اور پڑھا یہ کہ سارے حیدرآباد میں حکومت کی طرف سے سوگ منایا گیا۔" اناللہ وانا الیہ راجعون"

تمہارا بابا قاسم

---

۱۴ دسمبر ۱۹۵۱ء

السلام علیکم

عزیز نور۔ تمہارے قلمی خط نے مجھے اس قدر خوش کیا اور اتنی ہمت بڑھائی اور اس قدر اطمینان بخشا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ تمہارے اپنے ہاتھ سے خط نہ لکھنے کی وجہ میں معلوم نہیں کر سکتا تھا۔ میں معلوم کر سکتا تھا اور معلوم کر لیا اور وہی میرے لئے انتہائی تکلیف کا باعث تھا۔ میرے سامنے تمہاری ایک مغموم تصویر پھیر جاتی تھی، اور ایک طرح کی دنیا سے بیزاری کا نقشہ نظر کے سامنے آجاتا تھا اور اس کے ساتھ ہی بڑے سے لے کر چھوٹے تک سب بچوں کی صورتیں سامنے آتیں۔ اس کا مجھ پر کیا اثر ہوتا ہوگا تم اندازہ لگا لو۔ مگر تمہارے اس قلمی خط نے وہ سارے نقشے مٹا دیے۔ اب میرے سامنے وہی نورجہاں ہے جو میری غیر حاضری میں آبادی سے دور دشمنوں کے نرغہ میں اپنے بچوں کو لئے شیرنی کی طرح ان کی حفاظت کرتی تھی۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔ رنج و پریشانی ہمارا شیوہ نہیں۔ صبر و استقلال ہمارا خاندانی و آبائی شیوہ اور عمل رہا ہے اور رہے۔

تمہارا ۲۵- نومبر کا خط مجھے یکم دسمبر کو مل گیا تھا۔ چونکہ تمہارے خط کے ملنے سے ایک دو روز اول ہی میں نے تم کو خط لکھا تھا اس لئے یہ خط تاخیر سے لکھ رہا ہوں۔ میں بیمار ہوں مگر اللہ شافی ہے جس طرح سیکڑوں مصائب اور بیماریاں آئیں اور بفضل تعالیٰ چلی گئیں، اسی طرح اب بھی ہو گا۔ بالکل بالکل فکر نہ کرو۔ تمہارا

قاسم

اچھی نور۔ پیاری آمو جانی۔ پیارے بچو۔ السلام علیکم۔ دعائیں۔ پیارے نور کی حالت اور عمل معلوم کر کے میرے دل کو تقویت ہوئی۔ بیشک قاسم رضوی کے دادا کی پوتی کو ایسی ہی باہمت و استقلال عورت ہونا چاہیئے تھا۔ نور جہاں پر نہ صرف میرے دس اور تین تیرہ بچوں کی ذمہ داری ہے بلکہ ان لاکھوں بچوں کی بھی ذمہ داری ہے جو خدا نے اپنی نوازش سے مجھے اور نور کو دیئے ہیں بلکہ اُن کی ذمہ داری پہلے ہے۔ ان تیرہ کی ذمہ داری بعد۔ خدا نور جہاں کو ہمیشہ باہمت و استقلال ملت کی خدمت پر آمادہ رکھے اور توفیق خدمت عطا کرے۔ نور۔ اس دنیا میں کسی سے "نہ ستایش کی تمنا رکھو نہ صلہ کی پروا کرو"۔ یہ دونوں خواہشیں عبث ہونے کے علاوہ خود غرضی بھی ہیں۔ بے لوث خدمت اور صرف بے لوث خدمت ہی خدمت کا بہترین صلہ ہے۔ اور ایسی خدمت پر اپنے دل اور ضمیر کا اطمینان بہترین ستایش۔ کسی کا اعتراف

خدمت کرنا یا صرف خاموش ہی رہنا تو کجا ایک مخلص کو ہر برائی سننے
اور جھیلنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ اور ہر کام اللہ کے واسطے ہو اور
بس۔ تم بھی کسی کے کسی عمل کی یا قول کی پرواہ کئے بغیر اپنے ضمیر کی آواز
پر دوڑے جاؤ جو تم مناسب سمجھتی ہو۔ اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ اپنی طرف
سے کسی کی بد خواہی بدگوئی یا برائی نہ ہو چاہے کوئی اپنا کتنا ہی برا کیوں
نہ کرے۔ ایک بات بتا دوں پارٹی بندی اور پارٹی پالیٹکس کے پھیر میں
نہ پڑنا، اور اگر کوئی تم کو پروپاگنڈہ کا آلہ بنانا چاہے تو اس سے
صاف وصریح انکار کر دینا۔

مشتاق بھیا کا شکریہ خدا ان کا بھلا کرے، انھیں اور ان کے
بال بچوں کو سلام شوق وپیام محبت پہونچا دو۔ میری صحت کے
تعلق سے اس سے پہلے کے خط میں لکھ چکا ہوں۔ تم لوگ رتی
برابر فکر نہ کرو۔ جب تک مجھ میں قوتِ ارادی باقی ہے کوئی بیماری
بھی مجھے زیر نہ کر سکے گی "انشاء اللہ" یکے بعد دیگرے یا ایک ساتھ
مجھ پر امراض حملہ کرتے ہیں اور میں اپنی Will Power سے
ان کو آیا گیا کر دیتا ہوں۔ سب دوست احباب عزیز اقارب کو سلام دعا۔
واجد رضوی وہیں وکالت کر رہے ہیں اُن کو میرا سلام پہونچاؤ۔ ہر اُس
مخلص محب کو جو مجھے یاد کرتا ہو۔ میرا سلام شوق کہو اور دعائے خیر دو۔

اچھا اب خدا حافظ۔ فی امان اللہ تمہارا
قاسم

